قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا بہتّرواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اپریل 2015ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم

علامہ اقبالؒ (ضربِ کلیم کی نظم علم اور دین کا ایک شعر)

جلد 68 شمارہ نمبر 04 اپریل 2015ء

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: اقبال کا کلام پھیکا پڑ جائے گا	سلیم اختر	4
پرویز صاحب کا نظریہ اجتہاد (فقہ)	ملک منظور حسین لیل	6
دین کا ایک اہم گوشہ	خواجہ ازہر عباس	13
متحرک نفسیات	راجہ عبدالعزیز	20
تقریب بیادِ پرویز	ادارہ	28
مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے	عاطف طفیل	29
اَوجِ مدو پرویز	حنیف وجدانی	31
بیادِ علامہ پرویز صاحب	حمیرا فاروقی	33
ج ھ ل جَهْلٌ اور ج و ب	غلام احمد پرویز	35
مفہوم القرآن سوفٹ ویئر	شہاب آفتاب	43
باب المراسلات	ادارہ	44

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Naziat* (النّٰزِعٰتِ) – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez
Parah 30: Chapter 5 Translated by: Dr. Mansoor Alam 51

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور ۔ 54660، (پاکستان)
فون: 042-35714546
E-mail: idarati@gmail.com

ناشر و چیئرمین
محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی
محمد سلیم اختر

قانونی مشیر
ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون 40 روپے فی پرچہ
پاکستان -/450 روپے سالانہ
بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر
3082-7 نیشنل بینک آف
پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ
برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہوجا
ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہوجا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تواے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال وپر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرزندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریرو پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تندرو کوہ وبیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا
ترے علم ومحبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

سلیم اختر

اِقبال کا کلام پھیکا پڑ جائے گا

1921ء میں غلام احمد پرویز بسلسلہ تعلیم لاہور آئے تو ان کے دادا جان نے انہیں لاہور میں دو بزرگوں سے ملنے کی تاکید کی۔ ایک امام الدین نجّار جو نواں کوٹ کے علاقہ میں رہتے تھے اور جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں اور دوسرے علامہ اقبال۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ وہ اوّل الذکر بزرگوار سے تو ایک آدھ مرتبہ ہی ملے لیکن حضرت علامہ اقبال کے ہاں جو ایک دفعہ گئے تو ان کے تبحرِ علمی سے فیض یاب ہونے کے لیے بار بار ان کی محفل میں گئے۔ بقول پرویز یہ اقبال ہی کا فیضان تھا کہ ان کی سمجھ میں یہ نکتہ بھی آیا کہ قرآنِ کریم کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رُو سے سمجھنا چاہئے اور کسی خارجی عنصر کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔ (بحوالہ ''تصوف کی حقیقت'' باب ''رسم وراہِ منزلہا'' و دیباچہ لغات القرآن صفحہ:19 ایڈیشن 1984ء)

پرویز صاحب کی تصنیف ''مجلس اقبال'' کے ''آغازِ سخن'' میں محمد عمر دراز مرحوم نے لکھا ہے کہ پرویز صاحب نے ایک نجی نشست میں بتایا کہ ان ملاقاتوں کے ابتدائی دور میں ایک دن، حضرت علاّمہ نے اُن سے استفسار کیا کہ پرویز تم ہمارے شعروں پر ہی سر دھنتے ہو یا تمہیں خود بھی کچھ ذوقِ سخن ہے۔ انہوں نے جواباً عرض کیا کہ ہاں میں بھی شعر کہتا رہا ہوں۔ اس پر علاّمہ صاحب نے اُن سے اپنے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ پرویز صاحب نے کہا کہ جب سے آپ کا کلام سامنے آیا ہے، میرے اپنے شعر پھیکے پڑ گئے تھے، اس لیے میں نے بیاض پھاڑ کر پھینک دی ہے۔ اس پر علاّمہ اقبالؒ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر تمہاری زندگی میں ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تمہارے نزدیک اقبال کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں گے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں ''اس کے بعد کچھ اور ملاقاتی آ گئے اور ہمارا یہ سلسلۂ کلام جاری نہ رہ سکا۔ لیکن حضرت علاّمہ کی اس بات نے مجھے خاصا پریشان کر دیا۔ یہ بات میرے امکانِ تخیل سے باہر تھی کہ کبھی اقبالؒ کے اشعار بھی بے رنگ ہو سکتے ہیں۔'' اتفاقاً چند روز تک پرویز صاحب مجلسِ اقبال میں حاضر نہ ہو سکے اور ان کا یہ اضطراب اور پریشانی بڑھتی رہی۔ چنانچہ ایک شام وہ خاص اہتمام کر کے، محفل جمنے کے عمومی وقت سے ذرا پہلے حاضرِ خدمت ہوئے اور علاّمہ صاحب کو یہ بات یاد دلا کر پوچھا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کبھی اقبالؒ کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں۔ اور اگر یہ ہو سکتا ہے تو ایسا کب ہوگا۔ حضرت علاّمہ نے جواب دیا کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے اور یہ اُس وقت ہوگا جب ''قرآن تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو جائے گا۔''

اسد ملتانی علیہ الرحمۃ حضرت علامہ اقبال کے معروف شاگرد ہیں۔ انہوں نے ایک نظم بعنوان ''مقصودِ اقبال''، مجلسِ مرکزیہ یومِ اقبال، لاہور کے منعقد کردہ ''یوم اقبال'' منعقدہ 10 اپریل 1939ء کے لیے لکھی۔ اس نظم کے آغاز میں ایک نوٹ دیا گیا تھا کہ ''یہ

اشعار محض تخیل پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک سچے واقعہ کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔'' اگر آپ اوپر کی سطور میں بیان کردہ واقعہ کو سامنے رکھ کر اسد ملتانیؒ کی یہ نظم پڑھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ نظم بھی اسی واقعہ کو بیان کر رہی ہے جو کہ پرویز صاحب نے ایک محفل میں بیان کیا تھا۔ اسد ملتانی اور پرویز صاحب کی وجہ دوستی بھی اقبال علیہ الرحمۃ ہی تھے۔ اب آپ مذکورہ نظم ملاحظہ فرمایئے:

مقصودِ اقبالؒ

کہا اقبالؔ سے اک ہمنشیں نے
سخن تیرا شراب آتشیں ہے

کچھ اس انداز سے گرما دیے دل
کہ اب تسکین ممکن ہی نہیں ہے

حرارت ہے ترے سوزِ نوا کی
کہ بجلی سی دلوں میں جاگزیں ہے

کلامِ شاعراں پروردۂ عصر
مگر تیرا سخن عصر آفریں ہے

اثر میں ہے یہ صُورِ محشر انگیز
کشش میں نغمۂ خُلد بریں ہے

بدل ڈالا مذاق اس نے ہمارا
دل اب طرزِ کہن پر نکتہ چیں ہے

ترے اشعار پڑھ کر اب نظر میں
کسی کی شاعری جچتی نہیں ہے

یہ سُن کر حضرتِ اقبالؔ بولے
فقط لطفِ سخن کافی نہیں ہے

زمینِ شعر ہی میں گم نہ ہو جا
فلک وہ ڈھونڈ جس کی یہ زمیں ہے

مرے فکرِ فلک پیما کی پرواز
ادب پروردۂ رُوح الامیں ہے

فراغ عشق و سوزِ آرزو سے
سخن میرا تب و تاب آفریں ہے

مگر میرے سخن کی روشنی بھی
''چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے''

میرے اشعار میں پھنس کر نہ رہ جا
اگر تو سالکِ راہِ یقیں ہے

تری نظروں میں ہیں میری تصانیف
مری نظروں میں قرآنِ مُبیں ہے

گذر جانا مری بزم سخن سے
رہِ قرآں میں گامِ اولیں ہے

جو تو اس طرح قرآں تک پہنچ جائے
تو حاصل دولتِ دنیا و دیں ہے

محیطِ کائناتِ دل ہے قرآں
نظر کی آخری منزل ہے قرآں

ملک منظور حسین لیل۔بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط دوم

پرویز صاحب کا نظریۂ اجتہاد (فقہ)

(قانون سازی)

قانون سازی کا اہم ترین کام، ہر دور میں، بدلتے حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر، قرآن کریم کی حدود میں رہتے ہوئے، پوری امت کی مشاورت سے جاری رہے گا۔ مشاورت کا طریقہء کار بھی پوری امت کی مشاورت سے وضع اور طے کیا جائے گا۔ انفرادی یا اجتماعی (گروہی) تدبر و تحقیق کو صرف تجاویز کی حیثیت حاصل ہو گی۔ قانون سازی کا اختیار کسی ایک فرد، گروہ، جماعت پارٹی یا فرقہ کو حاصل نہیں، یہ پوری امت (یعنی اسلامی مملکت) کا کام ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد:۔ طلوعِ اسلام جون ۱۹۷۵ء۔ص۔۷-۳:" کچھ عرصہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا۔ اور قرآن کریم نے جو پہلے وارننگ دی تھی کہ "کیا تم پھر اپنے سابقہ مسلک کی طرف پلٹ جاؤ گے۔" مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ اور اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ یعنی انسانی معاملات دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ وہ جن کا تعلق امورِ دنیا سے سمجھا گیا اور دوسرا وہ جسے مذہبی امور کہہ کر پکارا گیا۔ یہی وہ "قدیم مسلک" تھا جس کے متعلق وارننگ دی گئی تھی کہ تم کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا۔ اب امورِ مملکت (یعنی دنیاوی امور) سلاطین نے سنبھال لئے اور مذہبی امور مذہبی پیشواؤں کی تحویل میں آ گئے۔ سلاطین کے لئے تو آسان تھا کہ وہ جس طرح بھی چاہتے اپنے احکام نافذ کرتے۔۔ مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ مسئلہ دقت طلب ہو گیا کہ مذہبی امور کے فیصلوں کے سلسلہ میں کیا طریق عمل اختیار کیا جائے۔ مشاورت کا تو مذہب میں تصور ہی نہیں ہوتا۔۔ اس لئے قرآن میں جہاں شوریٰ کا حکم دیا گیا تھا، اس کی تاویل یوں کر لی گئی کہ اس کا تعلق امورِ دنیا سے ہے، مذہبی امور سے نہیں۔ مذہبی امور کے لئے "شریعت" کی اصطلاح اختیار کی گئی اور کہا یہ گیا کہ اعتقادات اور نماز، روزہ، حج، زکواۃ، نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق مسائل دائرہء شریعت میں آتے ہیں۔ دین کے نظام میں، ہر دنیاوی کام جو احکامِ خداوندی کے مطابق سرانجام دیا جاتا، عبادت (یعنی خدا کی محکومیت) قرار پاتا تھا۔۔۔ اب عبادت کا مفہوم پرستش قرار پا گیا اور اس کا دنیاوی امور سے کوئی تعلق نہ رہا۔

روایات کے مجموعے:۔ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ سوال غور طلب تھا کہ جو امور ان کے

دائرہ اقتدار میں دے دیئے گئے ہیں ان کے متعلق فیصلے کس طرح کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ ان امور کی جزئیات نہ تمام کی تمام قرآن مجید کے اندر موجود تھیں اور نہ ہی دین کا نظام باقی تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جس دور میں دین کا نظام قائم تھا (یعنی عہدِ رسالتمآب ﷺ اور خلافتِ راشدہ) اس میں نافذ العمل جزئیات کا کوئی مستند مجموعہ تحریری طور پر امت کے پاس موجود نہیں تھا۔ بناء بریں، اس کے سوا کوئی شکل نہیں تھی کہ جو کچھ لوگوں کی زبانی معلوم ہو، اسے جمع، مدون اور مرتب کر دیا جائے۔ یوں روایات کے مجموعے مرتب کئے گئے اور جو جزئیات ان میں ملیں انہیں احکامِ شریعت قرار دے کر۔۔۔ امت کے لئے واجب العمل ٹھہرا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جو روایات اس طریق سے جمع ہوئی تھیں ان میں بہت سے اختلافات اور تضادات تھے۔ ان اختلافات کی بناء پر امت میں تفرقہ پیدا ہو گیا اور مختلف فرقے وجود میں آ گئے۔ بالخصوص اس لئے کہ بے شمار روایات خود وضع کر کے انہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا تھا۔

فقہ:۔ ''زمانے کے تقاضے تو کسی مقام پر رک نہیں سکتے۔ وہ آگے بڑھتے گئے اور ان کے لئے نئی جزئیات کی ضرورت پڑتی گئی۔ اس سے یہ سوال سامنے آیا کہ اب کیا کیا جائے؟ فقہاء نے اس کا حل یہ سوچا کہ جو کچھ شریعت کے نام سے موجود تھا اس پر غور و فکر کے بعد ایسے احکام مستنبط کئے جائیں جو زمانے کے ان بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ استنباطِ مسائل کے اس طریق کو اجتہاد کہا جاتا ہے اور جو احکام اس طرح مستنبط ہوں وہ فقہ کہلاتی ہے۔ چونکہ فقہ بھی ذاتی طور پر مستنبط اور مرتب ہوئی تھی (یعنی نظام کی طرف سے نہیں بلکہ مختلف ائمہء فقہ نے اسے ذاتی طور پر مرتب کیا تھا) اس لئے اس میں بھی اختلاف فطری امر تھا۔ یوں اُمت میں مزید فرقے پیدا ہو گئے۔ کچھ وقت کے بعد یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ اجتہاد کی رو سے بھی جس قدر فیصلے کئے جانے مقصود تھے وہ سب کئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا، اب مزید اجتہاد کا دروازہ بھی بند ہے۔ اُمت پر یہ جمود صدیوں سے طاری ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دین کے نظام کے باقی نہ رہنے سے اسلام کیا سے کیا ہو گیا؟ وحی کا دروازہ خدا نے بند کیا تھا، روایات جمع اور مرتب ہو گئیں تو یہ سلسلہ بھی آخری حد تک پہنچ گیا۔ کچھ آگے بڑھنے کے لئے اجتہاد کا طریق اختیار کیا گیا تو کچھ عرصہ کے بعد اس کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ اس کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ یہ اُمت فرقوں میں بٹ گئی، اور قرآن کے الفاظ میں کیفیت یہ ہو گئی کہ: كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲)۔ ''ہر فرقہ مگن ہو کر بیٹھ گیا کہ سچے اسلام پر وہی کاربند ہے۔ باقی سب باطل پر ہیں۔'' حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ''سچا اسلام'' کہیں بھی نہیں رہا تھا۔ سچے اسلام کے معنی تھے ایک اُمت۔ اس کا ایک نظام۔ نظام کی ایک مرکزی اتھارٹی جو باہمی مشاورت سے احکامِ خداوندی کو نافذ کرتی، جو ان جزئیات کا تعین کرتی جو قرآن میں نہیں تھیں۔ ان میں عند الضرورت اضافہ بھی کرتی اور تغیر و تبدل بھی۔ اس نظام کے نہ رہنے سے امت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسی تشتت و انتشار کی طغیانیوں اور فقدانِ مرکزیت کی تباہ کن حیرانیوں میں صدیوں سے امت گرفتار چلی آ رہی ہے۔۔۔ اس سے بعض (دین کی حقیقت سے نا آشنا) ذہن اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ وحی کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ اسی بناء پر بعض لوگ خود مدعیءِ نبوت بن بیٹھے۔ اسی پریشانیءِ فکر و نظر کا پیدا کردہ وہ فرقہ ہے جو ہمارے زمانے میں پنجاب میں نمودار ہوا اور ''اہلِ قرآن'' کے نام سے متعارف ہے۔ اسے اتفاق کہئے یا اہلِ پنجاب کی بدبختی کہ ''اہلِ قرآن'' اور ''احمدی'' دونوں خطہءِ پنجاب سے نمودار ہوئے اور کم و بیش ایک ہی وقت میں۔ یہ دونوں دین کے ''بہ حیثیت نظام'' کے تصور سے نا آشنا، اور اسے ایک

''مذہب'' سمجھتے تھے (اور سمجھتے ہیں)۔''

تشکیلِ فقہ:۔ طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۸۱ء۔ص۔ ۲:۔ ''مملکتیں وجود میں آتی ہیں، مملکتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ سلطنتیں قائم ہوتی ہیں، سلطنتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ حکومتیں بنتی ہیں، حکومتیں ٹوٹتی ہیں۔ یہ تاریخ کی گردش دو لابی ہے۔ جو شروع سے آج تک جاری و ساری ہے۔ حکومتوں کے نفع بخش کارناموں کی یاد، ان کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں رہتی اور زبان پر آتی ہے۔ اُن کے مظالم کا رونا خود ان کی موجودگی میں بھی رویا جاتا ہے۔ ان کے مرتب اور نافذ کردہ قوانین بھی اپنی مدت العمر ختم کرنے کے بعد صفحہء تاریخ سے مٹ جاتے ہیں۔ ان کی جگہ دوسرے قوانین لے لیتے ہیں۔ اس تبدیلی میں کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگتا کیونکہ زمانے کے تقاضے جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی حکومت جو لکیریں مذہب کے نام سے کھینچ دیتی ہے ان کی عمر بڑی دراز ہوتی ہے اور (اگر وہ غلط تھیں تو) ان کی تباہ کاریوں کا سلسلہ بھی مدتِ مدید تک جاری رہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ مذہب کا تعلق انسان کے لطیف ترین جذبات سے ہوتا ہے اور ان کے پیدا کردہ نقوش مٹتے مٹتے بھی صدیاں لے لیتے ہیں۔۔۔ قرآن مجید نے اس سلسلہء محو و ثبات کے لئے ایک نئی طرح ڈالی۔ اس نے کچھ اقدار متعین کیں اور کچھ اصول عطا فرمائے جن کے متعلق کہہ دیا کہ: لاتبدیل لکلمٰتہ۔ یہ کبھی تبدیل نہیں ہو سکیں گے۔ لامبدل لکلمتہ۔ حکومتیں آئیں اور جائیں۔ ان کے آئین و دساتیر بدلتے رہیں۔ لیکن ان ابدی اصول و اقدار کو کوئی حکومت نہیں بدل سکے گی۔ ان کا نام اسلام ہے۔ اور ان کے مطابق قائم کردہ نظام کا نام:۔ ''الدین''۔ ''الدین'' کے یہ اصول و اقدار غیر متبدل رہیں گے، ان کے نفاذ کے طور طریق بدلتے جائیں گے۔ جس حکومت کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا، وہ اسلامی حکومت کہلائے گی۔ اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہوگی، تو قرآنی اصول و اقدار، قرآن کے صفحات میں محفوظ رہیں گے۔ اور ان کے نفاذ کے لئے جو طرق و اسالیب (سابقہ) اسلامی حکومت نے وضع اور نافذ کئے تھے ان کی اسلامی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ ان کی حیثیت، مذہبی رسوم و مناسک کی رہ جائے گی۔ یہ وہ قدرِ مشترک ہوگی جس کے ساتھ تمسک، یا جس کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے سے، اتنا ہی ہوگا کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والی قوم کا تشخص باقی رہے گا۔ ان رسوم و مناسک کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لینا انہیں کتاب اللہ کے ہم پلہ قرار دینا ہوگا جو شرک ہے۔۔۔ اسلامی حکومت، حضور نبی اکرم ﷺ کے دورِ ہمایوں میں قائم ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تک قائم رہی۔ اس حکومت میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی تھی۔ کتاب اللہ کے احکام و اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے لئے جو طریق اختیار کئے گئے تھے (جنہیں آپ جزئی قوانین شریعت کہہ لیجئے)، انہیں نہ غیر متبدل قرار دیا گیا تھا، نہ انہیں علیٰ حالہٖ قائم رکھا گیا۔ یہ وجہ تھی کہ اُس دور میں کتاب اللہ کی حفاظت کا تو اس قدر اہتمام کیا گیا لیکن ان جزئی قوانین کو نہ کہیں مرتب و مدون کیا گیا، نہ ان کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا گیا۔ انہیں زمانے کے تقاضوں کے تحت بدلتے رہنا تھا اس لئے انہیں منضبط کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔۔۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ احادیثِ رسول اللہ ﷺ یا عہدِ خلافتِ راشدہؓ میں جاری کردہ احکام کا کوئی مجموعہ اس زمانے میں ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا، تو اس کی وجہ ہی یہ تھی۔ جس چیز کو غیر متبدل رہنا تھا (یعنی کتاب اللہ) اس کی نشر و اشاعت اور نظم و ضبط کا انہوں نے ایسا اہتمام کیا کہ (امام ابن حزمؒ کے قول کے مطابق) عہدِ فاروقیؓ میں مملکت میں قرآن مجید کے قریب ایک لاکھ نسخے پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن اُس دور کے

بدلتے رہنے والے احکام کی ایک چٹ بھی کہیں نہیں ملتی۔۔۔اس کے بعد بنوامیہ کا دور آیا۔اس دورِ حکومت کا جو نہایت بھیانک نقشہ تاریخ میں کھینچا گیا ہے، ہم سر دست اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ہم اس کی صرف ایک خصوصیت کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔اور وہ یہ کہ انہوں نے بھی اپنے احکامِ حکومت کا کوئی ضابطہ مرتب نہیں کیا۔اور جب مرتب ہی نہیں کیا تو اس کی حفاظت کا سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔آپ اُس دور میں نہ کسی خاص فقہی مذہب کا نشان دیکھیں گے، نہ فقہی قوانین کے کسی مجموعہ کا تذکرہ۔انہوں نے بھی قرآن ہی کی حفاظت کی اور اسی کو آگے پہنچایا۔یہ وجہ ہے جو اس دور میں نہ امت میں فرقے پیدا ہوئے، نہ فرقہ وارانہ فقہیں وجود میں آئیں۔۔۔اس کے بعد عباسی دور ہمارے سامنے آتا ہے۔جو سابقہ ادوار سے بالکل ہٹا ہوا ہے۔ان کی حکومت بھی اسلامی نہیں تھی۔کیونکہ ملوکیت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں جو یک جا ہو ہی نہیں سکتے۔

دورِ عبّاسیّہ:۔ لیکن اس دور میں مختلف فقہیں مرتب ہوئیں۔ان کی وجہ سے امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔توحید نام تھا ایک کتاب اللہ کی حکمرانی کا۔جب اس کی حکمرانی نہ رہی تو امت میں توحید بھی باقی نہ رہی۔توحید تو ایک طرف، امت کی وحدت بھی باقی نہ رہی۔وہ حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی وغیرہ گروہوں میں بٹ گئی۔یہی وہ فرقہ بندی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے شرک قرار دیا تھا۔جوں جوں یہ دور آگے بڑھتا گیا، امت کا انتشار، خلفشار، افتراق، اختلاف بھی زیادہ ہوتا گیا۔اب امت کا کوئی فرد، صرف ''مسلم'' کے نام سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔اسے بتانا پڑتا تھا کہ کون سا مسلمان۔۔شیعہ، سُنی، اہلِ حدیث، اہلِ فقہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی (اور نہ جانے کتنی اور اضافی نسبتیں)۔۔۔عباسی دورِ حکومت ختم ہو گیا۔لیکن اس دور میں پیدا شدہ مختلف فقہیں اور ان کی نسبت سے مختلف فرقے آگے چلتے گئے۔اب انہی فقہوں کا نام اسلام ہے۔اور ان کے پیروؤں کا نام مسلمان۔اور نظامِ حکومت ملوکیت۔یعنی مسلمانوں کی زندگی اصول اور فروع، دونوں کے اعتبار سے خلافِ اسلام!۔یہ فقہی احکام چونکہ زمانے کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے، اس لئے فطرت کے اٹل قانون کے مطابق یہ آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے تھے۔اس کی جگہ مسلمان مملکتوں نے اپنے یہاں سیکولر نظام رائج کر لیا۔یعنی قرآن کی طرف وہ پھر بھی نہیں آئیں۔قرآن کی طرف وہ آ بھی نہیں سکتی تھیں۔قرآن تو ہر قسم کی شخصی حکومت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔۔۔مدت سے مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی کی یہی صورت ہے۔یعنی نظامِ حکومت، ملوکیت یا سیکولر ہے۔اور اس میں شخصی قوانین کی حد تک کسی نہ کسی فقہ کے احکام کارفرما۔قرآن کا مصرف، صرف یہ رہ گیا:۔۔۔''کہ از یٰسین او، آساں بمیری۔'' (کہ قرآن کی سورہ یٰسین پڑھنے سے تیرا مرنا آسان ہو جاتا ہے)۔''

تشکیلِ فقہ کا زمانہ:۔ تمام فقہ جات کی تشکیل کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔اور یہ وہ زمانہ ہے جب مرکزی حکومت کی داخلی فطری نوعیت (Nature) یعنی اس کے اوصاف و خواص میں عملی تبدیلی (Practical Change)۔خلافت سے ملوکیت۔واقع ہوئی۔دورِ ملوکیت میں، چونکہ مرکز سے قوانین کے اجراء اور ان پر امت کے متفقہ عمل کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ملوکیت آ گئی، لہٰذا، امت کے مقننین، انفرادی طور پر قانون سازی کرنے پر مجبور ہو گئے۔پبلک اور پرسنل لا زالگ الگ ہو گئے۔جس کا نتیجہ الگ الگ دینی و دنیاوی نظامہائے تعلیم (یعنی دینی مدارس سے دنیاوی مدارس کی علیحدگی)، الگ الگ فقہ جات، فرقوں، الگ نمازوں

اور الگ مساجد کی شکل میں سامنے آیا۔ عبّاسی دور سے قبل، دستیاب تاریخ (Available History) میں ہمیں کسی الگ فقہ، فرقہ، الگ نماز یا الگ مسجد کا نشان نہیں ملتا۔ دورِ امیہ میں (تاریخ کے بیانات کے مطابق) ہزار خامیوں کے باوجود، مملکت کے حکام ہی اپنے اپنے علاقے میں نمازوں کی امامت کرایا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ امت نے، حجاج بن یوسف (جسے تاریخ نے کسی اچھے حاکم اور انسان کے طور پر پیش نہیں کیا) کی امامت میں، ایک ہی مسجد میں، مل کر نمازیں ادا کیں اور اُس نے بھی ایک ہی مسجد کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ فقہ جعفریہ کے نام سے ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات کی فقہ حضرت امام جعفر صادقؒ نے مرتب فرمائی تھی۔ ان کا زمانہ بھی وہی ہے۔ ان سے پہلے شیعہ حضرات کے پانچ ائمہ حضرات گزر چکے تھے مگر ان میں سے نہ کسی نے کوئی الگ فقہ مرتب کی، نہ الگ فرقہ قائم ہوا، نہ ان کی نماز الگ ہوئی اور نہ ہی ان کی کوئی الگ مسجد تعمیر کی گئی۔ اس بارے میں نظریہ تاریخ (خلافت سے ملوکیت) کے تحت بھی وضاحت کی جا چکی ہے، جسے ایک بار پھر ملاحظہ فرما لیا جائے (مؤلف)۔

اسلامی حکومت:۔ طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۸۱ء۔ ص۔ ۱۱۔ ''جو حکومت قرآن کریم کے مطابق قائم ہوگی اور اس کے قوانین و احکام بھی اسی کے مطابق ہوں گے، اسے اسلامی حکومت کہا جائے گا۔ جو اس معیار پر پوری نہیں اترے گی، وہ غیر اسلامی ہوگی، خواہ کہنے والے اسے لاکھ اسلامی کہیں۔ لیکن قرآن کریم کی صورت یہ ہے کہ اس میں (بجز چند احکام) ایسے اصول دیئے گئے ہیں جو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہیں۔ یہ اصول ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ اسلامی مملکت، ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، انہیں بروئے کار لانے کے طریق، امت کے مشورہ سے خود وضع کرے گی۔ یہ اصول اور حدود ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے، لیکن انہیں بروئے کار لانے کے لئے جو جزئی احکام وضع کئے جائیں گے، وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ (علامہ اقبالؒ کی اصطلاح کے مطابق) ثبات و تغیر کے اس حسین امتزاج سے، اسلام، ابدالآباد تک ایک زندہ نظامِ زندگی کی صورت میں رواں دواں رہے گا۔ حضور نبی اکرم ﷺ، والذین معہٗ۔۔ (صحابہ کبارؓ) نے اسی اسلام کو عملاً قائم کیا تھا۔ اُس دور میں ابدی اور غیر متبدل صرف کتاب اللہ کی قائم کردہ حدود کو سمجھا جاتا تھا۔ مملکت کے وضع کردہ جزئی قوانین و احکام قابلِ تغیر و تبدل ہوتے تھے۔

ملوکیت کا کردار:۔ یہ نظام کچھ عرصہ تک قائم رہا۔ اس کے بعد ملوکیت آ گئی۔ ملوکیت سے مراد ہے ایسی حکومت، جو قرآن کے منشاء کے مطابق، امت کے مشورہ سے قائم نہ ہو، بلکہ بزورِ شمشیر مسلط کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس حکومت کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ جس کی بنیاد ہی غیر اسلامی ہو، وہ حکومت اسلامی کیسے کہلا سکتی ہے۔ اور اس کے وضع کردہ احکام اسلامی شریعت کیسے قرار پا سکتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی حکومت تھی اور اس کے قوانین و احکام سیکولر۔ اس وقت سے آج تک، ہماری (مسلمانوں کی) حکومتوں کی یہی کیفیت چلی آ رہی ہے۔ اُن سلاطین نے امورِ مملکت اپنے ہاتھ میں رکھ لئے تھے، اور افراد کی نجی زندگی کے متعلق امور کو علماء کی تحویل میں دے دیا تھا۔ اس کے لئے اس زمانے کے ماہرین قوانین نے کچھ قوانین مرتب کئے۔ انہیں فقہی قوانین کہا جاتا ہے۔ ان میں سے حکومت جن قوانین کو مفیدِ مطلب سمجھتی، بطور قانونِ مملکت نافذ کر دیتی، اور یوں اپنے آپ کو، یا دوسروں کو فریب میں مبتلا کر دیتی کہ وہ اسلامی ہے۔ ان فقہی قوانین کی کیفیت یہ تھی کہ:۔ (۱)۔ مختلف فقہاء نے اپنی اپنی فقہیں الگ الگ مرتب کی تھیں۔ تعداد کے لحاظ

سے تو یہ بکثرت تھیں لیکن ان میں سے اس وقت صرف چند ایک مشہور اور مروّج ہیں۔ شیعوں کی فقہ جعفری اور سنیوں کی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی فقہ۔ ہر فقہ کا ماننے والا، ایک الگ فرقہ سے متعلق ہوتا ہے۔'' (۲)۔ ص۔ ۱۳۔ ''جن فقہاء نے انہیں مرتب کیا تھا، وہ ہزار متقی اور پرہیزگار سہی، لیکن یہ بہرحال دورِ ملوکیت میں وضع ہوئے تھے، اس لئے ملوکیت کی پیدا کردہ فضا سے ان فقہاء کا (شعوری نہ سہی، غیر شعوری طور پر) متاثر ہوجانا فطری امر تھا۔ اسی فضا کا اثر تھا کہ یہ حضرات عقیدہ کی رو سے، بزورِ شمشیر حاصل کردہ موروثی بادشاہت کو قاطع اسلام قرار دیتے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے ان سلاطین سے ایسا نہیں کہا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان بادشاہوں کو خلافِ اسلام قرار نہیں دیا۔۔۔ یہ محراب و منبر سے ان کے حق میں۔ ایدہ اللہ بنصرہ۔ اور۔ خلد اللہ ملکہٗ۔ (خدا اس مملکت کو اپنی تائید و نصرت سے مستحکم رکھے) کی دعائیں مانگتے رہے۔ (۳)۔ تیسری بات یہ کہ فقہی قوانین بہرحال انسانوں کے مرتب کردہ تھے۔ وہ اُس زمانے کے تقاضوں کو، جس میں وہ مرتب ہوئے تھے، پورا کرتے ہوں، تو ہوں، لیکن وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل تو نہیں رہ سکتے تھے۔ ابدی اور غیر متبدل تو صرف قوانین خداوندی ہو سکتے ہیں۔ انسانی قوانین کو کسی ایسی صفت سے متصف کر دینا جو قوانین خداوندی کے لئے مختص ہو، شرک ہے۔ لہٰذا، یہ قوانین وقتی تھے اور قابلِ تغیر و تبدل۔۔ خود ائمہ فقہ جنہوں نے انہیں مرتب کیا تھا،، انہیں ایسا ہی سمجھتے تھے۔۔ ان ائمہ فقہ میں، امام اعظم ابوحنیفہؒ کا اسم گرامی سرِ فہرست آتا ہے۔۔ ان کے متعلق، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:۔ امام زفر فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحب فرماتے ہم اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن امام صاحب نے (امام) ابو یوسف سے فرمایا کہ یعقوب! تیرا نہ اس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے، سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ کو ابو یوسف سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو، کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب۔ (تاریخ خطیب بغدادی۔ جلد ۱۴۔ ص۔ ۳۵۲)۔۔۔ یہ تھی ان قوانین کی حیثیت، خود ائمہ فقہ کے نزدیک۔ لیکن ان کے بعد، ان کے معتقدین نے یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ یہ قوانین ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ اور انہی کو اسلامی شریعت سمجھا جائے گا۔ گزشتہ ہزار سال سے مسلمانوں کی جو سلطنتیں چلی آ رہی تھیں، وہ سیکولر سٹیٹس تھیں جن میں امورِ مملکت کے متعلق حکومت کے قوانین نافذ ہوتے تھے اور شخصی امور کے سلسلہ میں فقہی قوانین۔ (آج بھی ان سلطنتوں کی عام طور پر یہی حالت ہے)۔''

احادیث، فقہ اور نظامِ حکومت:۔ پرویز صاحب ہماری کتبِ فقہ میں ''نماز روزہ'' کے احکامات کی تفصیلات کی کثرت اور ''عدل'' جیسے دیگر قرآنی احکامات کی بہت کم بلکہ ناکافی تفصیلات کی موجودگی کی وجوہات بتاتے ہیں کہ:۔ ''سوچئے کہ نماز اور روزہ سے متعلق احکام میں سنتِ رسول اللہ ﷺ کی مطابعت کے بارے میں اس قدر شدت اور عدل اور قتال کے احکام کے سلسلہ میں سنتِ رسول اللہ ﷺ سے ایسی بے اعتنائی!۔ ایسا کیوں ہے؟۔ اس کا جواب واضح ہے کہ یہ احکام اُس زمانے میں مدون ہوئے تھے جب مذہب اور حکومت میں ثنویت پیدا ہو چکی تھی، جس کی رو سے نماز روزہ، مذہب کے دائرے میں آئے تھے اور عدل اور قتال حکومت کے حیطہء اقتدار میں۔ لہٰذا، اتباعِ سنت کی تاکید اور شدت اعتقادات اور عبادات کے باب میں برتی گئی۔ اور نظامِ حکومت کو مملکت

کے حوالے کر دیا گیا۔ اسلامی مملکت میں ایسا نہیں ہوگا۔ اس میں قرآن کے تمام مجمل احکام کی تفصیلات، مملکت متعین کرے گی۔''
(حضور کریم ﷺ کی ساری زندگی پاک کا اوّل و آخر مقصد ایک قرآنی حکومت کا قیام تھا اور انہوں ﷺ نے عملاً ایسا کر کے دکھایا۔ ہمیں احادیث و سنن اور فقہ کے ذخائر میں نظامِ حکومت کے بارے میں بہت زیادہ مواد ملنا چاہیئے تھا جس سے ہم آج فائدہ اُٹھاتے۔ لیکن بدقسمتی سے ان ذخائر میں ہمیں ایسی تفصیلات بہت کم ملتی ہیں۔ یہ دورِ ملوکیت کی ''مہربانی'' ہے)۔ (جاری ہے)

☆.....☆.....☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورہ الصفت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	400/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	سورۃ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

دین کا ایک اہم گوشہ

اللہ تبارک وتعالیٰ عزاسمہ کا مقام اتنا بلند اور اس کا مرتبہ اس درجہ عالی ومعالی ہے کہ وہ خود اپنے بندوں سے براہِ راست کوئی معاملہ یا تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ انسانیت سے تعلق ورابطہ رکھنے کے لئے اپنے انبیاء کرام کو درمیان میں ڈالتا ہے اور پھر ان کے ذریعے معاملہ طے کرتا ہے۔ وہ نہ براہِ راست کلام کرتا ہے اور نہ براہِ راست اپنی اطاعت کراتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد عالی ہے۔ وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (2:118) (ترجمہ) اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں انہوں نے بھی ان ہی کی طرح کی بات کہی۔ ان سب کے دل ایک جیسے ہو گئے ہیں۔

اِن ناواقف لوگوں کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ محمد ﷺ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ اُن سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اللہ نے ان ہی کو ہمارے اندر ہم کلامی کے لیے کیوں منتخب کیا ہے۔ آخر ہم جو قریش ہیں اور اثر واقتدار میں محمد ﷺ سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ اللہ ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا۔ ان کے اس مطالبہ کا جواب سورۃ الشوریٰ میں یہ دیا گیا کہ کسی انسان کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہِ راست کلام کرے۔ وہ صرف وحی کے ذریعے یا پردہ کی آڑ کے پیچھے سے صرف انبیاء کرامؑ سے بات کرتا ہے، ہر کس وناکس اس عظیم مرتبہ کا اہل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (6:124) (ترجمہ) اللہ خوب جانتا ہے اس موقع کو کہ جہاں بھیجے اپنے پیغام۔ لیکن یہاں خاص طور پر اس مطالبہ کا جواب نہیں دیا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اعتراض ہی بڑا گستاخانہ تھا بس صرف اتنا فرما دیا کہ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ (2:118) شروع سے ہی اس قسم کے گستاخ لوگ اسی طرح کہتے چلے آرہے ہیں۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (2:118) ان سب کی ذہنیت ہی ایک جیسی ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کی ذہنیت پر ایسا تبصرہ کیا ہے جو آج تک درست ہے۔ بھلا قرآنِ کریم کا تبصرہ ہو اور نعوذ باللہ غلط ہو جائے۔ آج بھی یہی ذہنیت چلی آرہی ہے۔ یہ الہام، القاء، کشف، استخارہ، تفاول، روئے صادقہ کیا ہیں۔ براہِ رراست علم الٰہی حاصل کرنے کے سب چور دروازے ہیں اور اسی تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ کی عملی تعبیر۔

لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ہر نبی کی ایک طبعی زندگی ہوتی تھی اور انسانیت کے ایک مرحلہ پر انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ بھی

ختم ہونا تھا۔ حضورؐ کی ذاتِ مبارکہ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوا۔ نبی کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کا انسانیت سے رابطہ نبی کے ذریعہ ہوتا تھا۔ نبوت وہ بلند مقام تھا جو انسانیت کا اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم رکھتا تھا۔ ختم نبوت کے بعد اب اللہ تعالیٰ سے انسانیت کا رابطہ اس کی وحی کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ وحی الٰہی کے ذریعہ ہی اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے اور اسی کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ آپ قرآنِ کریم کی تلاوت فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کا رابطہ قائم ہوجاتا ہے۔ آپ اس کی تلاوت ختم کردیں آپ کا ہم کلامی کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ البتہ اگر آپ بھی اس کا نظام قائم کرلیں اور اس نظام کے اندر آپ زندگی بسر کریں تو اللہ تعالیٰ سے آپ کا رابطہ دن سے رات تک، اور رات سے دن تک، مسلسل چوبیس گھنٹہ قائم رہتا ہے۔ اس رابطہ کو مسلسل قائم رکھنے اور مسلسل اللہ کی اطاعت کرنے کی غرض سے حضورؐ نے قرآنِ کریم کا نظام قائم کیا تھا۔ یہ نظام آسانی سے قائم نہیں ہوگیا تھا۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لئے حضور ﷺ کو بیاسی 82 دفاعی لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں کیونکہ اس نظام کا قائم کرنا حضورؐ پر فرض تھا (4:65،5:48) اور اس فریضہ کی ذمہ داری حضورؐ نے ادا فرمائی۔

اسلامی ریاست قائم کرکے حضورؐ نے اپنے فرائض سے تجاوز نہیں فرمایا تھا۔ حضورؐ کی موجودگی میں یہ نظام دس لاکھ مربع میل پر وسیع تھا۔ حضورؐ نے اپنے دور میں مقامی حکام مقرر فرمادیئے تھے (2:188) اور اولوالامر بھی مقامی حکام تھے (4:59) ارشاد باری تعالیٰ ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (4:59) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے مقامی حکام کی اطاعت کرو۔ ہمارے علماء کرام کا بھی اس بات پر اتفاق و اجماع ہے کہ اولوالامر کی اطاعت اسی طرح لازمی ہے جس طرح رسول کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعہ ہوتی تھی، اسی طرح رسول کی اطاعت اولوالامر کے ذریعے ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص سے غلطی یا کوئی لغزش ہوجائے تو اس کی معافی براہِ راست اللہ تعالیٰ سے طلب نہیں ہوسکتی اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خطا کار شخص اپنی خطا کی رسول (اور اس کے بعد اس کے جانشین) سے تلافی کرائے، خود اللہ تک براہِ راست وہ نہیں پہنچ سکتا (4:64)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تک شکایت بھی رسول کی معرفت ہی ہوسکتی تھی (58:1)۔ دعائیں بھی اسلامی نظام کی معرفت پوری ہوتی تھیں (27:62)۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضرت عثمانؓ کو صلح کرنے کی غرض سے مکہ والوں کی طرف بھیجا گیا تو یہ خبر اُڑ گئی کہ مکہ والوں نے حضرت عثمانؓ کو قید کرلیا ہے۔ اس خبر سے صحابہ کرامؓ میں بڑی بے چینی پھیل گئی اور خود حضور ﷺ کو بھی اس بات پر بڑا تردد ہوا کہ کہیں جنگ کا آغاز نہ ہوجائے اور اصل فکر کی وجہ یہ تھی کہ صحابہؓ کے پاس اسلحہ نہیں تھا وہ اپنا اسلحہ مدینہ میں چھوڑ کر گئے تھے اس پریشانی کے عالم میں حضورؐ نے صحابہؓ سے بیعت کی تجدید کی۔ اس پر قرآنِ کریم میں آیا فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (48:10) (ترجمہ) یہ تم سے بیعت نہیں کررہے تھے، یہ درحقیقت اللہ سے بیعت کررہے تھے۔ تم اللہ کی طرف سے اس بیعت کو لے رہے تھے چونکہ اللہ تو براہِ راست کوئی معاملہ نہیں کرتا۔ اس لیے یہ سارے معاملات اسلامی نظام ہی کرتا ہے۔ اسلامی نظام کا سربراہ یہ سارے معاہدے اللہ

تعالیٰ کی طرف سے کرتا ہے کہ اسلامی نظام کو قرض دو۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی جان اور ان کا مال جو خریدا ہے وہ بھی اسلامی نظام ہی خریدتا ہے۔ یہ کوئی ذہنی معاہدہ نہیں تھا۔ یہ ذہنی معاہدہ صرف مذہب میں ہوتا ہے۔ دین میں یہ عملی پروگرام ہوتا ہے اور اسلامی نظام مومنین کی جان و مال خرید کے، ان کو اسی دنیا میں جنت کی زندگی فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو وعدے کرتا ہے۔ وہ بھی خود پورے نہیں کرتا بلکہ انسانوں کے ذریعے ہی، اس نظام کی معرفت پورے کراتا ہے (36:47، 11:6)

یہاں تک یہ بات تحریر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست انسانوں سے معاملہ طے نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی اطاعت براہِ راست ہوسکتی ہے کیونکہ وہ کوئی محسوس جسم نہیں رکھتا۔ اس کی اطاعت اس کی وحی کی رُو سے کی جاتی ہے جو اس کا نبی لے کر آتا تھا چونکہ اس کی اطاعت براہِ راست نہیں ہوسکتی تھی نہ ہوسکتی ہے، اس لیے ہر نبی ایک ایسا نظام قائم کرتا تھا جو وحی الٰہی پر قائم ہوتا تھا اور جس نظام کی معرفت اللہ کی اطاعت ہوتی تھی۔ حضورؐ نے بھی ایسا نظام قائم فرمایا، جس کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے مترادف تھی۔ اس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا تھا کہ وہ نظام اس درجہ چمکدار تھا کہ لیلھا ونھارھا سواء اس کی راتیں بھی اس کے دن کی طرح چمکدار تھیں۔ اس کے برخلاف ہمارے دن بھی اس درجہ تاریک ہیں جس طرح ہماری راتیں تاریک ہوتی ہیں۔

یہ بات تحریر کرتے ہوئے دل خون کے آنسو روتا کہ آج اس وسیع و عریض زمین پر ایک گز بھی جگہ ایسی نہیں ہے کہ جس پر اللہ کی اطاعت ہو رہی ہو۔ ساری دنیا اللہ کی اطاعت سے محروم ہے۔ ہم مسلمانوں نے پرستش کو اطاعتِ الٰہی قرار دے کر خود کو بھی فریب دیا اور دوسری قوموں کو بھی اس نظام کے برکات و ثمرات سے محروم رکھا ہے۔ اس وقت بالکل وہ دور ہے جیسا حضور ﷺ کا ابتدائی دور بدر کے وقت تھا اور حضورؐ نے دعا فرمائی تھی کہ اگر یہ چند صحابہ اس جنگ میں فتحیاب نہیں ہوئے تو پھر مدت مدید اور عرصۂ طویل تک کوئی شخص اللہ کی اطاعت نہیں کر سکے گا۔ ہمارے اس موجودہ دور میں صرف تحریک طلوع اسلام ہی دین کی داعی ہے۔ اس تحریک کے علاوہ کوئی ایک جماعت یا کوئی ایک فرد بھی دین کا داعی نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ تحریک ناکام ہوئی تو پھر آئندہ مدتوں تک کوئی بھی دین کی دعوت لے کر نہیں اُٹھے گا۔

یہ سوال چاروں طرف سے اُٹھایا جاتا ہے کہ جب حضورؐ نے دین کا نظام قائم فرما دیا تھا جو دس لاکھ مربع زمین پر مشتمل تھا اور خلافت راشدہ کے دور میں یہ نظام وسیع ہو کر بتیس 32 لاکھ مربع میل پر قائم تھا اور اس نظام نے اپنے نتائج بھی بہت اچھے دکھائے تو یہ نظام منقرض کیوں ہوا اور اس کے انقراض کے بعد یہ نظام دوبارہ قائم کیوں نہیں ہوا۔ جب تک ان دو سوالوں کا جواب سامنے نہیں آتا، اور ان موانعات کی نشاندہی نہیں کی جاتی، اس وقت تک یہ نظام دوبارہ قائم نہیں ہوسکتا۔

یہ دونوں سوال وزن رکھتے ہیں اور ہمارے نزدیک بھی ان کا جواب دینا ضروری ہے۔ جہاں تک اسلامی نظام کے منقرض ہونے کا تعلق ہے اس کا اصل سبب وہ وسیع و عریض فتوحات ہیں جو بہت تیزی سے عمل میں آئیں۔ یہ حضورؐ کے دور میں جو حضرات مدینہ میں یا اس کے قرب و جوار میں رہتے تھے ان میں حضورؐ نے مستقل اقدار کا تصور اس طرح ذہن نشین کرایا کہ وہ تو علیٰ وجہ البصیرت ایمان پر

پختہ ہو گئے تھے۔ عرب کے دور دراز علاقوں میں اور دیگر فتح کردہ علاقوں میں اسلام کے نظریات دلوں میں جاگزیں نہیں ہوئے تھے۔ خصوصاً ایران کی آبادی اسلام سے برگشتہ ہی رہی۔ ہم اس موجودہ دور کے ایران کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ آج کے ایرانی ہمارے بھائی ہیں اور اسلام پر کاربند ہیں۔ ہم فتح ایران کے دور کی بات کر رہے ہیں۔ اس دور میں ایرانی عربوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور یہ بات شاہنامہ فردوسی سے خوب واضح ہے۔ شاہنامہ میں لکھا ہے۔

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاجِ کیاں راکند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مسلمانوں نے جو ملک بھی فتح کیا اس ملک کے لوگوں نے اپنی زبان ترک کر کے عربی زبان کو اختیار کر لیا۔ ان مفتوحہ علاقوں میں سے کسی ملک کے لوگوں کی زبان عربی زبان نہیں تھی لیکن جب مسلمانوں نے ان علاقوں کو فتح کیا تو افریقہ کا سارا شمالی حصہ، مصر سے لے کر مراکش تک، سب نے عربی زبان اختیار کر لی لیکن ایرانیوں نے عربی زبان اختیار نہیں کی کیونکہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس پر مزید تباہی یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں ملوکیت غالب آ گئی۔ بنوامیہ اور بنوعباس کی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ یہ بات بالکل ظاہر اور عیاں ہے کہ ملوکیت کے غلبہ کے بعد دین کا قیام ہی ناممکن ہے۔ دین قائم ہی نہیں رہ سکتا اور اس دین کا مذہب میں تبدیل ہونا بھی ایک منطقی نتیجہ تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ بنوعباس کے دور میں دین مذہب میں پوری طور پر تبدیل ہو گیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب ساری اُمتِ مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ اقامتِ دین فرض ہے اور اس کی فرضیت سے انکار کرنا کفر ہے تو خلافتِ راشدہ کے بعد سے آج تک کسی جگہ بھی دین قائم کیوں نہیں ہوا اور صرف تحریک طوع اسلام کو ہی اس تصور کی توفیق کیسے ہو گئی۔

حضورؐ نے اپنے دور مبارک میں دین کا نظام قائم کیا۔ یہ دینِ الٰہی جس کو حضورؐ اور صحابہ کرامؓ نے بڑی محنت شاقہ کے بعد عملاً عرب شریف میں قائم فرمایا تھا۔ اس دین کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ یہ حضورؐ کی کوئی ذاتی یا پرائیویٹ اطاعت نہیں تھی (3:79) بلکہ یہ ان کے سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے اطاعت تھی کیونکہ قرآنِ کریم نے تو شخصیات کا دور ہی ختم کر کے نظام اور اداروں کے دور کا آغاز کیا تھا۔ ہمارے فقہائے کرام کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے رسول کی اس اطاعت کو فی ذاتہٖ قرار دے دیا۔ حالانکہ حضورؐ کے اپنے دور میں بھی مقامی حکام (اولوالامر) کی اطاعت کو حضورؐ کی اطاعت کے مرادف قرار دیا جاتا تھا۔ یہ اطاعت صرف معروف میں ہوتی تھی (60:12) معروف کے علاوہ آپ کے مقرر کردہ مقامی حکام کی اطاعت ضروری نہیں تھی۔ حضورؐ کے بابرکت دور میں تو حضورؐ کی اطاعت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی تھی کیونکہ حضورؐ ہر وقت Accessible تھے۔ آپ جناب کا حکم جاری ہوا اور فوراً اس حکم کی اطاعت ہو گئی۔ جو بات قابل غور اور بحث طلب تھی وہ یہ تھی کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد حضورؐ کی اطاعت قیامت تک کس

طرح سرانجام دی جائے۔ ہمارے علمائے کرام نے حضورؐ کی اس اطاعت کو ان کی ذاتی اطاعت قرار دے کر اس اطاعت کو روایات کی طرف منتقل کر دیا اور رسول اللہ کا جانشین، روایات قرار دے دی گئیں اور اس طرح اقامتِ دین کا امکان ساری عمر کے لئے ختم ہو گیا۔ تحریک طلوع اسلام اس معاملہ میں بڑی خوش بخت ہے کہ اس تحریک نے قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق، اس اطاعت کو حضورؐ کے انتقال کے بعد اس زندہ اتھارٹی کی طرف منتقل کیا ہے جو اس نظام کو جاری رکھتی ہے۔ اس تحریک نے اس اطاعت کو رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف منتقل کیا اور اس طرح حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت عبادت الٰہی کے مرادف تھی۔ تحریک طلوع اسلام کے اس عقیدہ کے مطابق اقامتِ دین ایک لازمی اور لابدی فریضہ بن گیا۔ اس نظریہ کے مطابق اگر اسلامی نظام قائم نہیں ہے تو مسلمان عبادتِ الٰہی سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں۔ ہماری پیشوائیت چونکہ روایات کے ذریعے اطاعتِ رسول کرتی ہے تو اُسے دین کے قیام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ اصل سبب جس کی وجہ سے خلافتِ راشدہ کے بعد سے آج تک کسی جگہ بھی دین قائم نہیں ہوا۔ چونکہ ہمارے علماء کرام روایات کے اس مقام کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے دین کے قیام کا امکان بھی بہت Bleak اور موہوم ہی ہے۔

خلافتِ راشدہ سے لے کر آج تک اسلامی نظام کے قائم نہ ہونے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے عبادت کا قرآنی مفہوم ہی بدل ڈالا۔ عبادت کا لغوی اور قرآنی مفہوم اطاعت اور محکومیت اختیار کرنا ہے جس کے لیے ایک آزاد مملکت کی ضرورت ایک لازمی چیز ہوتی ہے۔ آپ قرآنِ کریم کا عبادت کا مفہوم ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن کریم نے عبد کے معنی غلام اور محکوم کے کیے ہیں۔ پرستندہ کے نہیں کیے۔ قصاص کے حکم کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (2:178) (ترجمہ) اے ایمان والو! فرض ہوا ہے تم پر (قصاص) برابری کرنا مقتولوں میں۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت (ترجمہ حضرت شیخ الہند)۔ اس آیہ کریمہ میں عبد کو حُرّ کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے۔ عبد حر کی اطاعت کرتا ہے، اس کی پرستش نہیں کرتا۔ سورۂ مومنون میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے قوم فرعون کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی تو قوم فرعون کے بزرگوں نے کہا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47) (ترجمہ) کہا ہم اپنے برابر کے دو آدمیوں پر ایمان لائیں اور ان کی قوم ہماری تابعدار ہے (ترجمہ حضرت شیخ الہند) حضرت عالی قدر نے عابد کا ترجمہ تابعدار فرمایا ہے۔ پرستندہ نہیں کہا اور اس کے حاشیہ میں حضرت علامہ عثمانی نے تحریر فرمایا۔ ''یعنی موسیٰؑ اور ہارونؑ کی قوم (بنی اسرائیل) تو ہماری غلامی کر رہی ہے ان میں کے دو آدمیوں کو ہم اپنا سردار کس طرح بنا سکتے ہیں۔) سورۃ الکہف میں عبادت اور محکومیت کے الفاظ بالکل مرادف المعانی استعمال ہوئے ہیں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) اللہ اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ دوسری جگہ ارشاد عالی ہے لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18:110) تم اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو سورۂ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا

لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔ اس بارے میں بے شمار آیات کریمات پیشِ خدمت عالی کی جاسکتی ہیں لیکن ہمارا مدعا ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اللہ کی عبادت سے مراد اس کی محکومیت اختیار کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ محکومیت اختیار کرنے کے لیے ایک آزاد اسلامی حکومت کا موجود ہونا ضروری ہے لیکن بدقسمتی سے ہماری پیشوائیت نے عبادت کے معنی پرستش کر دیئے۔ چنانچہ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ (16:114) کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے فرمایا: ''اگر تم اسی کو پوجتے ہو''۔ سورۃ الزمر میں ارشاد ہے قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ (39:14) اس کا ترجمہ فرمایا: ''تو کہہ میں اللہ کو پوجتا ہوں خالص کر کے اس کی بندگی اس کے واسطے۔'' اسی سورۃ میں پھر ارشاد ہے وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْھَا (39:17) اس کا ترجمہ تحریر ہے ''اور جو لوگ بچے شیطانوں سے کہ ان کو پوجیں۔'' جب ہمارے جید علماء کرام نے عبادت کا ترجمہ پوجنا کر لیا تو پھر اقامتِ دین کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ہر شخص ہر وقت کسی کو بھی پوج سکتا ہے۔ کسی کو پوجنے کے لیے اسلامی نظام کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ عبادت کا ترجمہ محکومیت کے بجائے پوجنا کرنے سے اسلامی نظام کی ضرورت کو ختم کر دیا گیا اور اسی وجہ سے خلافتِ راشدہ کے بعد سے آج تک اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکا۔ تحریک طلوع اسلام چونکہ قرآنی الفاظ اور قرآنی اصطلاحات کے خالص قرآنی معنی لیتی ہے اس لیے اس تحریک نے عبادت کے معنی بھی محکومیت لئے اور اسی لیے اقامتِ دین پر شدید اصرار کیا کیونکہ دین کی اقامت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو ہی نہیں سکتی۔

ہمارے نزدیک اسلامی نظام کے قائم نہ ہونے کے یہ دو اسباب تھے جو خدمتِ عالی میں پیش کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب تو اسلامی نظام کا قائم نہ ہونا ہے کیونکہ مسلمانوں کا عروج اور ان کا زوال ان کے نظام سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جو وعدے کیے ہیں کہ مسلمان ہمیشہ غالب رہیں گے (3 : 139) اور وہ کبھی مغلوب نہیں ہو سکتے (4:141، 58:21) یہ تمام وعدے اس کے نظام سے منوط (مشروط) ہیں۔ اگر مسلمان اپنا قرآنی نظام قائم کریں، تو اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے پورے ہو جائیں گے ورنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ''ایں سوراندہ وآں سودر ماندہ'' رہیں گے۔

اسلامی نظام قائم نہ کرنے کے علاوہ مسلمانوں میں تباہی کا دوسرا سبب ان کا روحانیت کا غلط اور خلافِ قرآن عقیدہ ہے۔ جس قوم نے بھی روحانیت کا عقیدہ تسلیم کیا، اس نے کبھی بھی دنیا میں کوئی ترقی نہیں کی۔ وہ قوم ہر وقت پرستش اور توہم پرستی میں مبتلا رہتی ہے۔ پھر ہر شخص وہ کام کرتا ہے جس میں اس دنیا کے تعمیری نتائج کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور صرف اپنی انفرادی آخرت کو سنوارنے کے اعمال کیے جاتے ہیں اور اس طرح یہ دنیا تاریک سے تاریک تر ہوتی جاتی ہے۔

اس بات کو ذہن نشین فرمالیں کہ قرآنِ کریم میں کسی ایک جگہ بھی انسانی روح کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں صرف روحِ الٰہی کا ذکر ہے۔ اور جب یہ ''روح خداوندی'' انسان کو عطا کر دی جاتی ہے تو قرآنِ کریم نے اس کو ''نفس'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ (91:7) اور اسی کو انسانی ذات اور انسانی خودی کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے چونکہ روحِ انسانی کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اس لیے

قرآن میں کسی جگہ روح کی ترقی، یا اس کے تزکیہ کا بھی کوئی تذکرہ نہیں۔ نہ روح کے تزکیہ کے اصول بتائے گئے ہیں۔ ہاں البتہ قرآن نے انسانی نفس کا بار بار تذکرہ بھی کیا ہے اور اس کی نشوونما کے اصول وقانون بھی بتائے ہیں اور ان اصولوں پر عمل کرنے پر اصرار بھی کیا ہے۔ مزعومہ وموہومہ روح کی ترقی، یا روحانیت کے لیے جو اصول وقوانین ہمارے صوفیائے کرام نے وضع کیے ہیں، وہ ان کے خود ساختہ ہیں۔ ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں اور یہ سب اصول پرستش پر قائم ہیں اور ان تمام اصولوں پر عمل کرنے پر اصرار بھی کیا ہے۔ مزعومہ وموہومہ روح کی ترقی، یا روحانیت کے لیے جو اصول وقوانین ہمارے صوفیائے کرام نے وضع کیے ہیں، وہ ان کے خود ساختہ ہیں۔ ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں اور یہ سب اصول پرستش پر قائم ہیں اور ان تمام اصولوں کا مقصد دنیا کو ترک کرنا اس کو حقیر جاننا ہوتا ہے۔ اور ان اصولوں سے ایک دنیا بیزاری کی نفسیاتی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، جو دنیا میں اس قوم کے زوال کا سبب بنتی ہے اس کے برخلاف تزکیہ نفس سے انسان کی اپنی بھی ساری صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور قوم بھی ترقی کرتی ہے۔ جسم انسانی پر طبعی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے جبکہ نفسِ انسانی کی نشوونما وحی کے عطا کردہ قوانین کے مطابق ہوتی ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں انسان وحی کا محتاج ہوتا ہے۔ اس انسانی نفس یا ذات میں روح الٰہی کی تمام صلاحیتیں منتقل ہوجاتی ہیں جو خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ ان خوبیداہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کو فروغ دینا انسانی زندگی کا مطمح نگاہ ہوتا ہے۔ اس کی نشوونما مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے اور یہ صرف اسلامی نظام کے اندر ہی ہوسکتا ہے۔

بیشک قرآنِ کریم نفسِ انسانی کی نشوونما کو زندگی کا مقصد شمار کرتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ جسمِ انسانی کی پرورش کو نظر انداز کردیتا ہے۔ یہ جسم کی پرورش کو بھی پیشِ نگاہ رکھتا ہے کیونکہ جسم ہی وہ ذریعہ، وہ Vehicle ہے جس کے ذریعے نفسِ انسانی مستقل اقدار پر عمل کرتی ہے۔ جسم کی نشوونما اور ذات کی نشوونما کے اصول بالکل ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ یہ صرف قرآنی نظام ہی ایسا نظام ہے جس میں جسم اور نفس دونوں کی بیک وقت پرورش ہوتی چلی جاتی ہے اور اسی وجہ سے قرآن کا دعویٰ وحی ہونے اور بے مثل کتاب ہونے کا ہے کیونکہ یہ بے مثال نظام پیش کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کے نقطۂ نگاہ کے مطابق روح اور روحانیت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ سارا تصور ہی بے بنیاد ہے اور اسی وجہ سے یہ تصوف کا پورا سلسلہ ہی زمین بوس ہوجاتا ہے اور اس کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ مسلمان جب تک روحانیت کے چکر سے باہر نہیں نکلتے، اسی قعرِ مذلت میں پڑے رہ جائیں گے۔ اللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَ کِیْلٌ (12:66)۔

رات پی زم زم پہ مے اور صجدم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

(بشکریہ ماہنامہ صوت الحق بابت مارچ 2015ء)

☆.....☆.....☆

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

گیارویں قسط

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

قرآن پاک کے مطابق ہر انسانی بچے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفس، روح یا ذات عطا ہوتی ہے۔ بنیادی لحاظ سے یہ غیر نشوونما یافتہ (undeveloped) حالت میں ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اگلے ارتقائی مرحلے تک پہنچنے کی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات کی نشوونما کرے جس طرح اپنے جسم کی پرورش کرتا ہے تاکہ زندہ رہے۔ فرق یہ ہے کہ جسم کی نشوونما قوانین فطرت کے تحت ہوتی ہے اور ذات کی نشوونما قوانینِ وحی کی رُو سے ہوتی ہے، جو انسان کو انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ملتے تھے اور اب قرآن مجید میں محفوظ ہیں۔ نشوونما کے اس عمل میں نفس کی تین حالتوں یعنی نفس امّارہ، نفس لوّامہ اور نفس مطمئنۃ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ فرائڈ نے انسانی شخصیت کی ساخت کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ شخصیت تین بنیادی تنظیموں، لاذات یا ''ID'' انا (Ego) اور فوق الانا (Super ego) پر مشتمل ہوتی ہے۔ فرد کی ہر قسم کی سوچ، احساس اور فعل ان تینوں نظاموں کے اتحاد، اشتراک اور باہمی عمل کے نتیجے میں واقع ہوتا ہے۔ تاہم چونکہ ان کے بنیادی منصب اور اصول جدا جدا ہیں اس لیے اکثر اوقات ان کے درمیان تصادم اور کشمکش جاری رہتی ہے۔ جس کا اظہار فرد کی شخصیت میں ہوتا ہے۔ شخصیت کے پیچھے کام کرنے والی قوت کو فرائڈ نے لبیڈو (Libido) کا نام دیا ہے۔ فرائڈ کا خیال تھا کہ شخصیت کے زیادہ تر مقاصد کا تعلق لذت (Pleasure) کے حصول سے ہوتا ہے۔ اڈ (ID) جملہ جبلتوں کی خواہشات کا نام ہے۔ یہ بڑی حد تک لاشعوری سطح پر کام کرتی ہے۔ اپنی خواہشات کی فوری لذت اور تکلیف سے بچاؤ اڈ کا بنیادی اصول ہے۔ اپنی خواہشات اور انگیزشوں کی تسکین و تکمیل کے لیے کسی اخلاقی ضابطے کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ نہ ہی کسی منطق کو جانتی ہے، نہ قانون اور نہ ہی کسی قدر کی قائل ہے۔ یہ صرف اصول لذت (Pleasure principle) ہی کو مانتی ہے۔ اگر حصولِ لذت و مسرت کے طریقے تہذیبی یا سماجی اخلاقی ضابطوں کے منافی ہوں تو علامتی طریقوں سے یا بھیس بدل کر آسودگی کے ذرائع ڈھونڈتی ہے جو سماج کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ انسان کے بہت سے سفلہ جذبات اور منفی رجحانات بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ پروفیسر ساجدہ اسے نفسِ امّارہ قرار دیتے ہوئے اسے اندھی قوت اور منہ زور انگیزش کہتی ہیں۔ مختصر الفاظ میں یہ انسان کے سرکش، باغی اور بے باک شیطانی جذبات کی نمائندگی کرتی ہے۔

اِڈ اور غیر واضح انگیخیں بچے کی ابتدائی زندگی پر غلبہ کیے رہتی ہیں، جب اس کا رشتہ حقیقت کے ساتھ قائم ہوتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ بیرونی دنیا میں اپنی ضرورتوں میں امتیاز کرنا شروع کر دیتا ہے، اسے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ دوسرے اس سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ اس عمل کے دوران وہ ایک باشعور ذات کو جنم دیتا ہے جسے انا (Ego) کہتے ہیں جو حصولِ لذت کی بجائے حصولِ حقیقت کے تحت بروئے کار آتا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک یہ زنجیر کی کمزور ترین کڑی ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دونوں قسم کے متضاد تقاضوں کے درمیان کوئی ربط و آہنگ پیدا کرے اور اِڈ اور سپرا ایگو کے درمیان کوئی ایسا راستہ نکالے جس سے خواہشات بھی پوری ہوں اور سماجی تقاضے بھی، جس کی بنا پر انسان کو نہ تو پوری مجبوری کا احساس ہو اور نہ مطلق خود مختاری کا یا بالکل بے روک ٹوک خواہشات پوری کرنے کا۔ چنانچہ انا کا بنیادی مسلک میانہ روی ہے۔ اور یہ اصولِ حقیقت پسندی یعنی (Reality Principle) پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ انا کی کوشش یہی ہوتی کہ جبلی تقاضے اور جملہ خواہشات پوری تو ہوں، لیکن اتنا شترِ بے مہار نہ بن جائے کہ بیرونی حالت اور اخلاقی و سماجی مطالبات کی پرواہی نہ کرے اور نہ ہی فطری خواہشات پر جبر کے اتنے پہرے بٹھائے جائیں کہ گھٹ کر رہ جائیں اور فرد کے لیے نیو راتی یا مریضانہ (Neurotic disorder) طریقہ اظہار کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہ رہے۔ اس کی شدید صورت دیوانگی (Psychosis) ہوتی ہے۔ فرائڈ کی وضع کردہ زنجیر میں انا کمزور ترین کڑی بے شک ہو مگر اس پر جتنی بھاری ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں انہیں نبھانا او رمتوازن کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ انہیں صرف ایک قوی اور مضبوط انا ہی خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتی ہے۔ ورنہ بقول پروفیسر ساجدہ بیشتر صورتوں میں ایگو اتنی کمزور ہوتی ہے کہ یا تو فرد کسی نہ کسی طرح اس کشمکش میں مبتلا رہتا ہے اور ایگو تھالی کے بیگن کی طرح کبھی اِڈ کی طرف جھک جاتی ہے اور کبھی سپرا ایگو کی طرف، یا پھر غیر شریفانہ طریقے استعمال کرتی ہے۔ مثلاً فرد چوری، دھوکا، فریب اور زنا وغیرہ کا مرتکب ہو کر ان بڑے اور گھناؤنے اعمال کی پردہ پوشی کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتا ہے۔ یہ ایگو کے عمل کے ریاکارانہ طریقے ہیں۔

اِڈ کی اندھی قوت کا عین تضاد فوق الانا یا سپرا ایگو ہے۔ جو فطری جبلتوں کی کارکردگی سے نہیں بنتی بلکہ سپرا ایگو سماجی و اخلاقی ضابطوں کی پاسداری سے وجود میں آتی ہے۔ اس کا وجود فطری اور پیدائشی نہیں ہوتا بلکہ ارتقاء کے عمل میں تعلیم و تربیت اور سماجی اثرات کے تحت پیدا ہوتا ہے جو ''غلط افعال'' کی سرزنش اور ''صحیح افعال'' کی پذیرائی کے ذریعے بتدریج بڑھتی رہتی ہے۔ ابتداء میں جو باتیں انعام یا قبولیت کے لالچ یا سزا و تادیب کے خوف سے کی جاتی ہیں، وہ رفتہ رفتہ بطور پسندیدہ رویوں کے بچے کی سائیکی میں جڑ پکڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ اچھے یا بُرے کاموں کے فرق کو سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ یوں سماجی و خاندانی امر و نہی کی پابندی کرتے کرتے فرد کے اندر ایک ''سماجی ضمیر'' (Social Conscience) کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ فرائڈ کے خیال میں سپرا ایگو کی نشوونما کا مطلب اخلاقی اقدار کو اپنی ذات کا حصہ بنانا ہے تب فرد انہیں

دوسروں کی نہیں بلکہ اپنی اقدار تصور کرتا ہے۔ اوران پر عمل نہ کرنے کی صورت میں وہ احساسِ گناہ کا شکار ہوجاتا ہے۔ فوق الانا حصولِ لذت کے اصول پر کاربند نہیں ہے بلکہ اصول اخلاق (Ethical Principle) پر کاربند ہوتا ہے۔ فوق الانا اور اِڈ دونوں پرزور قوتیں ہیں، ایک دوسرے کی ضد ہیں اور عموماً برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ پروفیسر ساجدہ نے فرائڈ کے اِڈ وغیرہ جیسے نظریات پر سوالات اٹھائے ہیں کہ اگر انسان پر سماجی پابندیاں نہ ہوں تو کیا صرف اڈ کا غلام بنا رہے گا؟ دوسرے جانداروں سے اس کا عمل قطعاً مختلف نہ ہوگا؟ کیا واقعی عمل کے اصول میں انسان اور دوسری مخلوق میں کوئی فرق نہیں؟ کیا نیکی اور اخلاق کا سرچشمہ صرف سماج ہے وغیرہ وغیرہ۔ نیز یہ بھی کہ کیا اس کی سرشت میں ارتقاء ''ارتفاع'' تخلیق اور اخلاقیات شامل نہیں؟ وہ لکھتی ہیں ''ان امور کی بنا پر ماہرین نفسیات نے فرائڈ کی نفسیات کو تخفیفی نفسیات (Reductive Psychology) کہا ہے۔ یعنی فرائڈ نے انسان کو آخری تجزیے میں جانوروں کے مترادف خیال کیا ہے۔ اور اس کی ایک ''جبلت کے غلام'' کی شکل میں تخفیف کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر انسان کو جبلت کا غلام سمجھتا ہے۔''

فرائڈ کے ساتھیوں میں ایک اہم شخصیت کارل گستاف ژونگ (Carl.G.Jong 1876-1961) کی تھی جس نے فرائڈ کے کچھ نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے اس سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اس کا فرائڈ سے سب سے بڑا اختلاف اس کے جنسی نظریات سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فرائڈ نے شخصیت کی تشکیل میں جنسی محرکات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے اور فرد کے منفی رخ پر ہی توجہ مرکوز رکھی ہے، اور اس کے اندر موجود مثبت روحانی قوتوں کو مکمل طور پر نظرانداز کیا ہے، جن کا مطالعہ انسانی نفسیات کو درست طور پر سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ ژونگ کو فرائڈ کے ''عہد طفولیت کے جنسی نظریات'' سے بھی اختلاف تھا، اور اس نقطہ نظر سے بھی کہ شخصیت کی بنیاد عمر کے پہلے پانچ سالوں میں قائم ہوجاتی ہے۔ وہ زندگی کو کئی ادوار میں تقسیم کرتا ہے اور چالیس سال کی عمر سے شروع ہونے والی دہائی کو فرد کی زندگی کا اہم ترین موڑ قرار دیتا ہے۔ اس دور میں فرد اپنی جوانی کی دلچسپیوں اور مشاغل کی بجائے اپنی توجہ روحانی اور تخلیقی قوتوں کے فروغ پر صرف کرتا ہے۔ وہ تجربات اور مشاہدات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ فرد کے ذاتی تجربات اور اجتماعی لاشعور کے امتزاج سے اس کی منفرد اور امتیازی شخصیت وجود میں آتی ہے۔ ژونگ کے مطابق ذہنی صحت کی نشانی یہ ہے کہ فرد اپنی منفی خصوصیات سے بھی آگاہی رکھتا ہو اور انہیں قبول بھی کرتا ہو۔ اس امر کی بدولت فرد کو اپنے بارے میں حقیقی انداز میں سوچنے کا موقع ملتا ہے اور وہ اپنی خامیوں کو دور کرنے کی بھی کوشش کرسکتا ہے تاکہ وہ غیر ضروری مسائل اور مشکلات سے دوچار نہ ہو۔ ژونگ کا یہ بھی کہنا تھا کہ فرائڈ غیر ضروری طور پر تحلیل نفسی کو عقیدے کا ایسا حصہ سمجھتا ہے جس پر تنقید نہیں کی جاسکتی۔ فرائڈ کے برعکس ژونگ انسان کو ایسے تناظر میں رکھتا تھا، جس سے انسانی زندگی کو ایک افتخار اور معانی میسر آجاتے تھے۔ اور یوں اس کے لیے ایک بامقصد کائنات میں ایک جگہ بن جاتی تھی۔ بعد کی زندگی میں وہ اپنے خیالات کا اظہار زیادہ مابعد الطبیعیاتی طریقے سے کرنے لگا تھا۔ چنانچہ فرائڈ

نے جبلتِ حیات کے ساتھ جبلتِ موت کو شامل کر کے توازن برابر کرلیا تھا، اور ژونگ فرد کی تقسیم کا مطالعہ ایگو اور سائے (Shadow) کے حوالے سے کرنے لگا تھا۔ علاوہ ازیں ژونگ کی تصویروں میں چار کا عدد یا پھر چار سے بننے والے اعداد کی بھرمار ہوتی تھی۔

ژونگ سوئیز رلینڈ میں پیدا ہوا اور بحیثیت ایک ڈاکٹر سوئیز رلینڈ کے ایک ہسپتال میں اپنی پیشہ وارنہ زندگی کا آغاز کیا۔ اس نے فرائڈ سے الگ تحلیلی نفسیات (Analytical Psychology) کے نام سے نفسیات کے بارے میں اپنے نظریات کو پیش کیا۔ 1900ء میں وہ ایک ذہنی امراض کے ہسپتال میں چلا گیا اور ساتھ ہی ساتھ زیورچ کے ذہنی امراض کے کلینک میں بھی کام شروع کر دیا۔ ژونگ کی نفسیات کے شعبے کی مخصوص دریافتوں میں سرِ فہرست اس کا نظریۂ اجتماعی لاشعور (Collective unconscious) ہے۔ ژونگ نے فرائڈ کے نظریہ لاشعور میں ترمیم کی ہو یا اس دریافت کی توسیع کی ہو، بہرحال اس نے دعویٰ کیا کہ ذاتی لاشعور کے ساتھ اجتماعی لاشعور بھی موجود ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کے اجتماعی لاشعور کی قوت ابتدائے بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگتی ہے جو انفرادی لاشعور سے مختلف اور زیادہ بنیادی قوت ہے۔ ایسی قوت جس پر انسانی بچہ ہی قادر ہوسکتا ہے۔ یہ انفرادی لاشعور سے زیادہ فعال قوت ہے اور اس کا تعلق فرد کے ذہن سے نہیں بلکہ نسلِ انسانی کے ذہن سے ہے۔ یہ تمام نسل کے صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ تفصیل تو اس دریافت کی کافی طویل ہے، مختصر یہ کہ ژونگ کا خیال ہے کہ پیدائش کے وقت بچے کو جسمانی خصوصیات کے ساتھ کچھ نفسیاتی خصوصیات بھی ورثے میں ملتی ہیں۔ یہ خصوصیات انسان کے ان تجربات پر مشتمل ہوتی ہیں جن کا تجربہ (Experience) وہ ہزاروں سالوں سے کرتا چلا آرہا ہے۔ نسلِ انسانی کے مشترک تجربات کو ژونگ نے اجتماعی لاشعور قرار دیا ہے۔ تمام انسان ایک ہی قسم کا اجتماعی لاشعور رکھتے ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ژونگ نے کئی معاشروں کی قدیم تاریخ، آثارِ قدیمہ، پرانی تصاویر اور رسم ورواج کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ انسانوں میں نسل در نسل ایک ہی قسم کے لاشعوری محرکات کی جھلک نظر آتی ہے اور ان کا کردار مخصوص قسم کے تجربات سے متاثر ہوتا ہے۔ ژونگ نے ان عالمگیر مشترک تجربات کے لیے آرکی ٹائپ (Archetype) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ انسان اجتماعی لاشعور کا شعوری احساس نہیں رکھتا۔ آرکی ٹائپ تماثیل اور علامات عام طور پر خوابوں یا وژن (Vision) میں بروئے کار آتی ہیں۔

نسلِ انسانی کے ان نقوش یعنی آرکی ٹائپ پر ژونگ نے اپنی زیادہ تر تصانیف میں بہت زور دیا ہے۔ آرکی ٹائپ کا اظہار علامتی طریقوں سے ہوتا ہے، اور یہ علامتی اظہار زمانہ قدیم، بلکہ پروفیسر ساجدہ کے مطابق ''ماقبل تاریخ سے چلا آرہا ہے۔ اور ہر ملک، ہر قوم، ہر معاشرہ اور ہر تہذیب کے افراد نے اپنے تخلیقی اور تعمیری کاموں میں اس کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً چکر یا منڈل کی علامات یا چار گوشوں کی تکون وغیرہ کی علامت یا اسطور سازی کی انسانی صلاحیت یہ سب آرکی ٹائپ نوعیت کی

علامات ہیں۔ یا جس طرح انسان نے ہر زمانے میں کسی نہ کسی خدا یا ذات مطلق یا پرم آتما یا کسی ماورائی قوت کا ادراک کیا ہے اور اس کی پراسراریت سے خوفزدہ یا مرعوب ہوا یا اس کی پرستش کی، یہ علامات ماورائی بھی آرکی ٹائپ ہیں۔'' آرکی ٹائپ کے بارے میں ژونگ نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ''نفسیاتی نقطہ نظر سے آرکی ٹائپ جبلت کی شبیہ کی حیثیت سے وہ منزل ہے جس کی طرف تمام انسانی فطرت کا رخ ہے، یہ وہ سمندر ہے جس میں تمام دریا آکر ختم ہو جاتے ہیں۔''

ژونگ نے انسانی شخصیت میں دو قوی ترین رجحانات دریافت کئے۔ اور ان کے لحاظ سے انسانی شخصیت کو دو بڑے ٹائپوں میں تقسیم کیا (1) دروں بیں (Introvert) شخصیت اور (2) بیرون بیں (Extrovert) شخصیت، شخصیت کی ان اقسام کو بہت سے متاخرین نے اپنی تخلیق کی بنیاد بنایا ہے۔ ژونگ نے کانٹ کو دروں بیں اور ڈارون کو بیروں بین قرار دیا تھا۔ ژونگ نے شخصیت کو کارکردگی اور فرائض کے اعتبار سے بھی چار اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی فکری (Thinking)، جذباتی (Feeling)، حسّی (Sensational) اور وجدانی (Intutive) یہ اقسام ''بلحاظ کارکردگی'' انسان کی کارکردگی میں شخصیت کے اہم جھکاؤ یا قوی رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ فرائڈ کی طرح ژونگ نے بھی انسانی شخصیت میں تضادات کی نشاندہی کی ہے لیکن بہت بڑے فرق کے ساتھ، فرائڈ نے یہ کام جبلتوں کے تضاد سے لیا ہے، جبکہ ژونگ نے انسانی شخصیت کے بنیادی عوامل میں تضادات کی کارآفرینی کا تجزیہ کیا ہے۔ ان تضادات کے جوڑوں میں سب سے نمایاں (1) پرسونا (Persona) اور (2) سایہ (Shadow) پہلا جوڑا اور انیما (Anima) اور انیمس (Animus) دوسرا جوڑا ہے۔ ژونگ کے مطابق انسانی شخصیت کے دو رخ ہوتے ہیں ایک وہ جو فرد دوسروں پر ظاہر کرتا ہے، پرسونا یہی ظاہری چہرہ ہے۔ اور دوسرا رخ وہ جو فرد دوسروں کی نظروں سے بلکہ بعض اوقات خود سے بھی مخفی رکھتا ہے، سایہ یہی باطنی چہرہ ہے۔ ژونگ نے انسانی روح کی کرشمہ سازی میں سائیکی کے دو رخوں کو کافی اہمیت دی ہے، جنہیں اس نے انیما اور انیمس کا نام دیا ہے۔ انیما فرد کی سائیکی میں زنانہ عنصر اور انیمس عورت کی سائیکی میں مردانہ عنصر کو کہتے ہیں۔ ژونگ انہیں ''زنانہ عنصر روح'' اور ''مردانہ عنصر روح'' بھی کہتا ہے۔

ژونگ نے فرائڈ کے تصورِ لبیڈو کو تسلیم کرتے ہوئے اسے بہت وسعت دی ہے۔ فرائڈ نے اسے جبلت جنس کا ایک پہلو قرار دے کر اس کے معانی محدود کر دیئے تھے۔ مگر ژونگ کے خیال میں لبیڈو تمام مظاہر فطرت میں مضمر زندگی بخش قوت ہے۔ اس کے بہت سے اظہارات ہوتے ہیں اور یہ بنیادی طور پر ایک تخلیقی قوت ہے۔ ژونگ کا ایک مخصوص تصور ''زائد قوت'' یا ''زائد لبیڈو'' کا تصور ہے۔ یعنی انسانی لبیڈو کی قوت روزمرہ کے کاموں میں خرچ نہیں ہوتی۔ پروفیسر ساجدہ کے مطابق یہ زائد قوت یا تو علامتی، تخلیقی، اسطوری شکلیں اختیار کرتی ہے یا مذہب اور روحانی کشف میں اپنا اظہار کرتی ہے جو اس کی اعلیٰ ترین اور صحت مند صورتیں ہیں۔ اور اگر یہ علامتی راہیں نکاس کے لئے نہ ملیں تو یہ تخریبی کارروائی اور غیر سماجی کارروائیوں

میں اپنا انصراف کرتی ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ زائد لبیڈو کا رخ تعمیری اور تخلیقی کارگزاریوں کی طرف موڑ دے یا تخریبی سرگرمیوں کی سمت۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے لبیڈو کی اس زائد قوت کو انیما کی توانائی ظاہر کر کے اسے ذات کی تشکیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ اپنی مشہور تصنیف ''تین بڑے نفسیات دان'' میں اسے یوں بیان کرتے ہیں۔ ''انیما محض رجحانات کا نام نہیں بلکہ یہ بے انتہا توانائی بھی رکھتا ہے۔ جب یہ لاشعور سے شعور میں آتا ہے تو زندگی کے عام مظاہر میں آسودگی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح لاشعور سے تو وہ توانائی خارج ہوگئی اور انا نے شعوری لحاظ سے وہ توانائی حاصل نہیں کی تو پھر وہ توانائی کدھر گئی؟ شعور کا مرکز انا ہے جو اپنی جگہ آزاد اور خود مختار ہے۔ وہ لاشعوری توانائی سے رابطہ نہیں رکھتا۔ لہٰذا یہ توانائی شعور اور لاشعور کے درمیان اپنا مقام بنا لیتی ہے، جہاں یہ دونوں کے درمیان پل کا کام دیتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شعور اور لاشعور کی متضاد خصوصیات کا باہمی امتزاج ہوتا ہے جو ایک متحدہ شخصیت کو جنم دیتا ہے جسے ذات کہتے ہیں۔ یہ صرف ذات ہی کہ بدولت ہے جو انسان میں شعور اور لاشعور، خیر و شر اور دیگر تمام متضاد اور مخالف خصائص کا اجتماع اس انداز سے ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ انا جو پہلے تمام نفس کا مرکز تھی، اب خود ذات کا طواف کرتی ہے جس طرح زمین سورج کا، یوں اب ذات تمام نفس کی مرکزیت کی ذمہ داری اختیار کر کے تمام قوت اور توانائی کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ اگر ذات کی تشکیل ڈھنگ سے کی جائے تو اس کی مقناطیسی قوت سب پر چھا جاتی ہے۔ لیکن ذات کی تشکیل کوئی آسان کام نہیں اس کے لیے لامتناہی سعی اور جہد مسلسل کی ضرورت ہے۔'' اس طویل اقتباس میں ذات کی جو خصوصیات Characteristics بیان ہوئی ہیں میرے خیال میں درست ہیں، مگر جہاں تک خود ذات کا تعلق ہے یہ تحفہ خداوندی ہے جس کی ماہیت جاننا ممکن نہیں۔ ژونگ کے نزدیک ''ذات کی نشوونما مقصودِ حیات ہے اور انفرادیت کے مکمل اظہار کا نام بھی۔''

ژونگ نے نفسیاتی اقسام کو چار مدارج میں بیان کیا ہے۔ یعنی انسان کسی شے کی حقیقت یا اس کے وجود کا ادراک چار ذرائع سے کر سکتا ہے۔ (1) حس: خارجی ماحول سے ابتدائی واقفیت حواس خمسہ سے حاصل کی جاتی ہے۔ (2) سوچ: یعنی اشیاء کے ادراک کو مکمل کرنے کے لیے ان کو معانی عطا کرنا اور بعد میں ان کو انہی کے معانی کی روشنی میں سمجھنا سوچ کا مرہونِ منت ہے۔ (3) احساس: ہر شے کی قدر کا عملی طور پر تعین کرنے کا نام احساس ہے۔ وجدان (4) ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے کہ ژونگ کے مطابق ''مندرجہ بالا عناصر بظاہر انسانی معلومات کے لیے کافی نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت کے بعض پہلو ایسے ہیں جن تک رسائی مندرجہ بالا عناصر سے ممکن نہیں، اس صورت میں حقیقت کا ادراک بلا واسطہ کیا جاتا ہے۔ حقیقت اور اشیاء کے باہمی تعلق کے اس بلا واسطہ ادارک کا نام وجدان ہے۔ جہاں پہلے تین عناصر ناکام ہو جاتے ہیں وہاں سے وجدان کی حد شروع ہوتی ہے۔'' میرے خیال میں اگر ژونگ کے سامنے قرآن مجید ہوتا تو وہ وجدان کی جگہ لفظ ''وحی'' استعمال کرتا۔ کیونکہ ژونگ نے جو ذمہ داری وجدان کے نازک کندھوں پر رکھی ہے، قرآن پاک نے اسے ''وحی'' کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔

ژونگ کی نفسیات کا مرکزی نکتہ مذہب اور اس کے پیدا کردہ جذبات واحساسات ہیں۔ اس کی نفسیات پر مذہبی اثرات کا سراغ لگانا مشکل نہیں۔ اس کے مکان کے صدر دروازے پر قدیم یونانی ہاتف کے الفاظ جو ابھی تک تحریری شکل میں موجود ہیں یہ ہیں کہ "Called and not called, the God will be here." ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول ژونگ نے ایک سوال کے جواب میں کہا ''میں نہیں جانتا کہ میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں لیکن میں اسے جانتا ہوں۔ شہزاد احمد کے مطابق ژونگ کو جو دلچسپی مذہبی معاملات سے تھی، دیگر نفسی معالج اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرماتے ہیں۔ جن مسائل کا وہ ذکر کرتا ہے وہ یقینی طور پر ''سری'' (Esoteric) مسائل ہیں۔ شہزاد احمد کا کہنا ہے کہ اس طرح کے غیر واضح بیان ژونگ کی تحریروں میں عام ہیں مگر بہت متاثر کرنے والے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ ایک مفکر کے طور پر اس کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی مسائل ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ زندگی ایک بامقصد مہم ہے۔ تاہم عبدالحمید کے مطابق ''بعض مثبت پہلوؤں کے باوجود ژونگ کے نظریات نے تشکیلِ شخصیت کے موضوع کو سلجھانے کی بجائے مزید الجھا دیا ہے۔''

آسٹریا ہی سے تعلق رکھنے والا ماہر نفسیات الفرڈ ایڈلر (Alfred Adler 1870-1937) بھی فرائڈ کے ان ساتھیوں میں سے تھا جو اختلافات کی وجہ سے اس سے الگ ہو گئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ جبلی جارحانہ اور جنسی محرکات کے ساتھ ساتھ بہت سے معاشرتی محرکات بھی شخصیت کی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایڈلر کا تعلق تو فرائڈی گروہ سے تھا۔ فرائڈ کے متاخرین میں ایک گروہ ایسے ماہرین نفسیات کا بھی شامل ہے جس نے فرائڈ کے چند بنیادی تصورات، مثلاً لاشعوری محرکات کی فعالیت، تو قبول کئے، لیکن اپنے نئے تصورات کی بنیاد پر فرائڈ کے نظریات کی توسیع بھی کی اور جگہ جگہ اس سے اختلاف بھی کیا بلکہ اس کے کئی مفروضوں کی قطعی طور پر تردید بھی کر دی۔ ان ماہرین کے کام کا پس منظر اور کسی حد تک بنیاد تحلیل نفسی کے عام نظریات ضرور ہیں، لیکن انہوں نے فرائڈ کے برخلاف فرد اور اس کی شخصیت کا مطالعہ اس کے مکمل ماحول کے پس منظر میں کیا ہے اور یوں تحلیل نفسی کے عام تصورات کو سماجی ڈائمنشن دی ہے۔ نیز مجموعی طور پر ان میں وسعت، تنوع اور عام فہمی پیدا کی۔ اسی بنا پر نوفرائڈیوں کے نفسیاتی تصورات کو سماجی تصورات کہا جاتا ہے جن سے شخصیت اور نفسِ انسانی پر ماحول کے اثرات نیز انسانی محرکات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ نوفرائڈیوں کے تصورات میں کچھ باہمی اختلافات ضرور ہیں لیکن مجموعی طور ان کی دریافتوں کے تناظر ایک ہی قسم کے ہیں۔

نوفرائڈین کا تمام زور جبلتوں اور ان کی فعالیت پر ہے۔ انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جبلتوں پر دباؤ کی صورت میں اس کا نتیجہ نیوروسس (خللِ اعصاب) یا جنون (خللِ دماغ) ہوتا ہے۔ جبکہ یہ ماہرین سمجھتے ہیں کہ فرد کی تمام خواہشات اور زبردست رجحانات ماحول سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ ماحولی خلاء اور محض انفرادی سیاق وسباق میں فرد کو سمجھنا اور مجموعی ادراک کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے لبیڈو نظریے کی بھی تردید کی ہے۔ اور کہا ہے کہ ارتقاء کا رخ متعین کرنے میں فرد

کے بچپن سے لے کر بلوغت تک کے حالات وواقعات اور اپنے متعین کردہ مقاصد بنیادی سبب بنتے ہیں۔ سماجی نفسیات کی رو سے انہوں نے شخصیت کی تقسیم مثلاً ایگو، سپر ایگو اور اِڈ کی بھی تردید کی ہے۔ ان کے نزدیک شخصیت ایک مربوط اکائی ہے اور شعور ولاشعور ایک ہی عملی سلسلے کے دو رخ ہیں، آپس میں برسرِ پیکار یا خود مختار نہیں۔ یہی صورت ایگو، اڈ، اور سُپر ایگو کی ہے ان میں حدِ فاصل کھینچنا نہ تو ممکن ہے اور نہ مستحسن۔ فرائڈ نے ایگو کو زنجیر کی کمزور ترین کڑی قرار دیا تھا، لیکن یہ لوگ ایگو اور شعور کی فعالیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اپنے ماحول سے مطابقت کے لئے ایگو ہی ہمہ وقت کوشاں رہتی ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتی رہتی ہے، لہٰذا شعور کی کارفرمائی کی اپنی ایک منفرد اہمیت ہے اور اس کی فعالیت کا عکس ہر چیز پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خواہ وہ مدافعتی تدابیر ہوں یا نیوراتی فرار ہو، تخلیقی راستے ہوں یا بے عملی یا محبوبیت کے راستے ہوں۔ یہ تمام راہیں شعور کے منبع سے نکلتی ہیں۔ ایڈلر کے چند اہم نفسیاتی نظریات یہ ہیں۔ ''احساس کمتری'' (Inferiority Feeling) ''ترتیب ولادت'' (Birth order) ''عزم اقتدار'' (Will to power) ''معاشرتی دلچسپی'' (Social interest) ''احساس برتری''۔ ایڈلر کے خیال میں برتری اور فوقیت کی طرف فرد کا یہ رجحان بے ساختہ اور فطری ہوتا ہے اور زندگی میں سب سے قوی تحرک کی قوت ہوتا ہے۔ اڈلر نے خاندانی پوزیشن اور فرد کے طرزِ حیات وغیرہ کے بارے میں تصورات بھی وضع کئے ہیں۔

کیرن ہورنی کا تعلق بھی نوفرائڈین طبقے سے ہے۔ اس خاتون ماہر نفسیات کا خیال ہے کہ شخصیت کی حرکی نشوونما میں ماحول کے اثرات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ انسان کے محرکات، کشمکش اور تصادم طبعی نہیں ہوتے، یعنی جبلتوں وغیرہ کا تصادم وتضاد ان کی بنیاد نہیں ہوتا بلکہ فرد کا سب سے پہلے ٹکراؤ ماحول سے ہوتا ہے۔ بعد میں ان کی ارتقائی صورتیں خود فرد کی ذات میں ایسے متضاد تقاضے پیدا کر دیتی ہیں جن سے عہدہ برا ہونے کی کوشش میں فرد ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہورنی کے نزدیک ''انسان کی سب سے بڑی اور اہم ضرورت محفوظیت کی خواہش ہے۔ جب نمو پذیر بچہ خود کو دو انتہاؤں، محفوظیت کی فطری اور قوی خواہش اور ماحول کی بے اعتنائی، کے درمیان پاتا ہے تو اس میں کشمکش پیدا ہو جاتی ہے جو آگے بڑھ کر نیوروسس (عصبانی وذہنی امراض) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔'' اس کا کہنا ہے کہ مثالی ذات انسان کے مختلف آدرش اور اقدار کی پاس داری سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسان کا ایسا آئیڈیل ہوتا ہے جس تک پہنچنے کی وہ ہمہ وقت کوشش کرتا رہتا ہے۔ دیگر کئی ماہرین کی طرح کیرن ہورنی نے بھی شخصیت کی کلیت پر زور دیا ہے۔ وہ تشویش ہو یا کشمکش وتصادم، احساس محفوظیت کی خواہش ہو یا مثالی ذات کی طرف سفر، اس میں فرد کی پوری شخصیت شامل اور عامل ہوتی ہے۔ فرد بحیثیت کل ان مراحل سے گزرتا ہے اس کی زندگی کا ایک پہلو نہیں ہوتا۔

(جاری ہے)

ادارہ

تقریب بیادِ پرویز

غلام احمد پرویز کی ولادت 9 جولائی 1903ء کو ہوئی۔ 15 اکتوبر 1984ء کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہنے کے بعد 24 فروری 1985ء کو شام چھ بجے اس دارِ فانی سے اِنتقال فرما گئے۔ پرویز صاحب کے یومِ وفات کی مناسبت سے ادارہ طلوع اسلام لاہور میں بزمِ طلوع اسلام لاہور کے زیر اہتمام 8 مارچ 2015ء کو ایک تقریب بیادِ پرویز منعقد کی گئی۔ صبح 10 بجے تا 11 بجے درسِ قرآن کے بعد چائے کا وقفہ کیا گیا۔ بعد ازاں محترم محمد عمر صاحب نے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض ادا کرتے ہوئے مقررینِ کرام کو یکے بعد دیگرے دعوتِ اظہارِ خیال دینا شروع کی۔ اِس تقریب میں مری اور چنیوٹ سے حنیف وجدانی اور آفتاب عروج صاحب و دیگر احباب بھی تشریف لائے تھے۔ یہ تقریب 02:30 بجے تک جاری رہی۔ محترم شیخ اللہ دتا صاحب کے صدارتی خطاب کے بعد حاضرین مجلس کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی گئی اس طرح یہ تقریب اِختتام پذیر ہوگئی۔ اس تقریب کی تصویری جھلکیاں آپ طلوع اسلام کے میگزین زیر نظر میں ٹائٹل کے اندرونی صفحات نمبر 1 اور 66 پر دیکھ سکتے ہیں۔ گنجائش کی کمی کے باعث اس تقریب کے مقررین میں سے صرف تین احباب کی تقریروں کا خلاصہ بھی آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس تقریب میں جن احباب نے اظہارِ خیال کیا اُن کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

1۔ عبدالرحمن صاحب (پنجابی نظم)
2۔ محمد ارشد صاحب
3۔ ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب
4۔ شاہد نسیم صاحب
5۔ شکیل احمد مغل صاحب
6۔ خالد اقبال خالد صاحب (اردو نظم)
7۔ حمیرا فاروقی صاحبہ
8۔ خالد فاروقی صاحب
9۔ عاطف طفیل صاحب
10۔ ڈاکٹر اشتیاق صاحب
11۔ جناب حنیف وجدانی صاحب
12۔ ڈاکٹر صالحہ نغمی صاحبہ
13۔ ڈاکٹر سید فرید الدین احمد صاحب
14۔ جناب محترم شیخ اللہ دتا صاحب

☆.....☆.....☆

عاطف طفیل

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے

(تقریر بسلسلہ تقریب بیادِ پرویز)

محمد عمر صاحب نے جب مجھے پرویز صاحب کی Contribution towards the understanding of Quran کے متعلق کچھ کہنے کی دعوت دی ہے تو مجھے یوں لگا جیسے ٹیڈی بکرے کو زِرافے کا قد ناپنے کا کام سونپ دیا گیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ انوکھے لاڈلے کو کھیلنے کے لیے چاند مل جایا کرتا ہے۔ میری آج کچھ ایسی ہی صورت ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک ننگ دھڑنگ بادشاہ اپنے کارواں کے ساتھ دونوں اطراف کے بیچ موجود راہداری سے گزر رہا تھا فدوی رعایا چیف ترے جاں نثار بے شمار بے شمار کے نعرے لگا رہی تھی۔ وہ بادشاہ کی خوش لباسی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ اتنے میں ایک بچے کی نظر بادشاہ پر پڑی اور اس نے با آواز بلند کہا ''بادشاہ تو ننگا ہے۔''

مجھے پرویز صاحب اس بچے جیسے لگتے ہیں اُن کے کیے ہوئے X-rays نے ہمیں بتایا کہ بادشاہ سیاسی جماعتوں کا ہو یا مذہبی جماعتوں کا۔ اُن سب میں ''بے لباسی'' قدرِ مشترک ہے۔ ہم سب کو پرویز صاحب کے کیے ہوئے X-rays نے ہی بتایا کہ بھوکا خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے سے قاصر ہوتا ہے اور جب بھوکے سے ریاضی کا سوال پوچھا جائے کہ دو جمع دو کتنے ہوتے ہیں تو وہ جواب دیتا ہے چار روٹیاں۔

مذہب کی دنیا چمتکار کی دنیا ہوتی ہے۔ چراغ رگڑا اور بوتل کا جن نمودار ہوا اور آپ کی Wish list ایک ایک کر کے پوری ہونے لگی۔ پرویز صاحب نے تصورِ دین دیتے ہوئے ہمیں بتایا کہ بیج کو درخت میں تبدیل ہونے کے لیے پورا عمل (Process) درکار ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں پرویز صاحب نے Quick fixes کو مذہب کے ٹھیکے داروں کی کارستانی سے تعبیر کیا۔ Process oriented thinking درحقیقت Low of the farm ہے۔ جس میں کوئی Shortcuts موجود نہیں۔ جس دل میں صداقت کے لیے مرنے کی تڑپ ہے پہلے وہ اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے۔

آیئے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پیکرِ خاکی میں جان کیسے پیدا کی جاسکتی ہے۔ Average Human Being اپنی ذات کا تعین دوسروں کی Opinions سے کرتا ہے۔ اُسے اپنے ہونے کے لیے دوسروں کی گواہی درکار ہوتی ہے۔ جب کہ Self actualized person کا Self image اُس کے اپنے سوچے سمجھے Convictions سے بنتا ہے۔

پرویز صاحب منزہ قرآنی فکر کو سمجھنے اور سمجھانے کا غیر معمولی کام اس لیے کر پائے کیونکہ اُن کا Self-image دوسروں کی آراء (Opinions) سے تشکیل نہیں پاتا تھا۔ In other words اُن کی زندگی کا remote control اُن کے اپنے ہاتھ میں تھا جب کہ average human being اپنی زندگی کی کار میں As a passenger بیٹھا ہوتا ہے جب کہ ڈرائیونگ سیٹ پر آباؤ اجداد اور مروجہ تصورات براجمان ہوتے ہیں۔ سارے Key Decision makers یہاں موجود ہیں آیئے آج کے دِن کچھ فیصلے کریں۔ یہ میری تجاویز ہیں کیونکہ آج 1۔ قرآنک ریسرچ سنٹر کو قبضہ مافیا کی دسترس میں جانے سے پہلے dispose off کریں اور حاصل کردہ رقم سے ایک Fund بنائیں جس سے نوجوانوں کے لیے تربیتی ورکشاپ منعقد کی جائے جس میں اُنہیں فکرِ قرآن سے Step by Step روشناس کرایا جائے تاکہ وہ پھر فکرِ قرآن کے سفیر بن کر چار سُو پھیل جائیں۔ ان Training workshops کے Process flow کے لیے مجھ سے رجُوع کر سکتے ہیں اور اس کے نصاب کی تدوین کے لیے جناب شیخ اللہ دتا، ڈاکٹر فرید اور ڈاکٹر انعام الحق سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

2۔ آج کے دن ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ کتابوں کے اندر محفوظ فکرِ قرآن خود سے اُڑ کر سینوں میں نہیں اُتر جائے گا۔ اس فکرِ قرآن کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہمیں Communication کے جدید Channels استعمال کرنے ہوں گے لیکن اس ساری Exercise میں نادان دوستوں سے بچنا ہوگا۔ تھوڑے کہے کو بہت سمجھئے 3۔ ناظم ادارہِ طلوعِ اسلام جناب سلیم اختر صاحب وہ شخصیت ہیں جو برس ہا برس سے ادارے کے پلیٹ فارم سے سچ کی تلاش میں آنے والوں کی کشتی کنارے لگاتے رہتے ہیں ہمیں اُنہیں Life time achievement award دینا چاہیے۔

4۔ فکرِ قرآنی سے وابستہ Pioneers جیسا کہ ڈاکٹر زاہدہ درانی، جناب شیخ اللہ دتا، جناب اشرف ظفر، ڈاکٹر فرید، محمد عمر صاحب، میڈم شمیم انور کے تفصیلی Video interviews ریکارڈ کیے جائیں جس میں وہ پرویز صاحب اور تحریک طلوعِ اسلام سے متعلق اپنی Stories شیئر کریں کیونکہ ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ قصے کہانیاں انسانی دِل و دماغ سے چپک جاتی ہیں اور باقی سب کچھ بھول جاتا ہے۔

فکرِ قرآنی سے وابستہ ہر فرد کو معاشی، عقلی و جذباتی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا چاہیے۔ مترفین کی صف میں شامل ہونا قابلِ شرم ہے۔ جبکہ مستضعفین کی Category میں شامل رہنا بھی قابلِ فخر نہیں ہے۔

محترم حنیف وجدانی صاحب (مری)

اَوجِ مہ و پرویز

(خلاصہ تقریر بسلسلہ تقریب بیادِ پرویز)

گفتند فرود آئی ز اوجِ مہ و پرویز
برخود زن و بابحر پُر آشوب بآمیز
با موج در آویز، نقشِ دگر انگیز، تابندہ گہرخیز

علامہ اقبالؒ کا شعر، جواب شکوہ میں ہے ؎

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہاں شانِ کئی سے مراد تین ایرانی بادشاہ کیکاؤس، کیقباد اور کیخسرو ہیں۔ کیخسرو کو خسرو پرویز بھی کہا گیا۔ قدم ایرانی فارسی میں پرویز ستارے کا نام ہے۔ آنکھوں کا تارا، ستارۂ صبح بڑی پیاری اصطلاحات ہیں۔ اگر شاہِ ایران کی والدہ اپنے بیٹے کو پرویز کہتی تھی تو وہ ایک قوت، آفاقیت اور روشنی کی دلیل تھی۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی پرویز نام عام اور مقبول ہے۔ جو روشنی قوت اور اقتدار کا ترجمان ہے۔ یہ ترجمانی فکرِ اقبال میں بھی جھلکتی ہے۔

میں جو فارسی شعر پیش کرنے لگا ہوں وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی عظمت اور اُمتِ مسلمہ کی کردار سازی، اجتماعی تنظیمی قوت اور شوکت وسطوت کا ترجمان ہے۔ میں اس کی تھوڑی سی وضاحت کردوں گا۔ لیکن اصل چاشنی اور لطافت فارسی دان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

ماند شبہا چشمِ اُو محرومِ نوم
تابہ تختِ خسروی خوابید قوم
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
فقر بخشی با شکوہِ خسروِ پرویز بخش
یا عطا فرما خرد بافطرتِ روح الامیں۔ یا چناں کُن یا چنیں

اسباب زوال اُمّت میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر
سود خوار و والی و مُلّا و پیر

ہمارا دیدہ ور علاّمہ پرویزؒ ہاتھ میں قرآن لیے دلائل کا مردِ میدان بن کر جاگیرداری، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت سے قوم کو نجات دلانے کی بات کرتا ہے۔ تو جواب میں کفر کا فتویٰ ملتا ہے۔ لیکن تابہ کے آج مذہبی پیشوائیت اپنے بنائے ہوئے جال میں گرفتار ہے۔ اللہ کرے مزید اسباب پیدا ہوں اور قوم کو اس اکاس بیل سے نجات ملے۔

وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۔ (4/30)

- میں 1957ء سے کنونشن میں باقاعدگی سے شرکت کرتا ہوں۔
- میں نے تصریف آیات کا فن محترم پرویز صاحب سے سیکھا۔ جس کا شہکار میری کتاب عزّۃ القرآن ہے۔
- محترم پرویز صاحب ایک وقت میں دو کام کرنے کا ذوق رکھتے تھے۔ میں نے بھی اس اچھے ذوق کا استعمال کیا۔ مثلاً اگر کسی کا انتظار کرنا ہو تو انتظار کے دوران کسی کتاب کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔

والسلام

❀❀❀

سانحہ ارتحال

بزم مینگورہ سوات کے ایک بزرگ و فعال کارکن میاں احمد زیب صاحب حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے 14 فروری 2015ء کو وفات پا گئے۔ مرحوم شاعر و ادیب بھی تھے اور فن خطابت کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ علاقے کے اہل علم و دانش لوگوں کا ایک حلقہ منسلک تھا۔ ہر وقت مختلف الخیال لوگوں کے ساتھ مختلف موضوعات پر محفل گرم رہتی تھی خاص کر سوشلسٹ فکر کے لوگوں کیساتھ ان کی گفتگو کا ایک نرالا انداز تھا۔ فوراً بات کی تہہ کو پہنچ کر ایسا مدلل جواب دیا کرتے تھے جس سے اختلاف کرنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ ہمارے ان ساتھیوں کو جو جلد حالات تبدیل کرنے اور سیاست میں حصہ لینے کا مشورہ دیتے تھے۔ کہا کرتے تھا کہ ادارہ ایک نرسری ہے۔ ایک اعلیٰ اور جلیل مقام رکھتا ہے۔ ادارہ کو ان دھندوں سے دور رکھا کریں۔ اس نرسری میں اتنے اتنے تناور اور پھلدار درخت پیدا ہونگے کہ پورا معاشرہ ان سے متاثر ہوگا۔

مرحوم و مغفور کی جدائی بزم طلوع اسلام سوات کیلئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالی مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں بلند مقام عطاء فرمائیں۔ اور ورثاء کو صبر جمیل عطاء فرمائیں۔ مرحوم و مغفور کی قرآن فہمی، پیغام قران کو عام کرنے کی تڑپ، علمی و ادبی ذوق حلقہ قرآنی میں ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔

غم گسار

خورشید انور (وائس چیئر مین)

وادارہ طلوع اسلام، لاہور

حمیرا فاروقی۔ لاہور

بیادِ علامہ پرویز صاحب

(یہ تقریر تقریب بیادِ پرویز میں پڑھی گئی)

اللہ کا ہم جتنا بھی شکر کریں کم ہے کہ وہ اپنے بندوں میں کچھ ایسے دیدہ ور روتی نرگس کو ہنسانے بھیج دیتا ہے جس سے گلشن کھل اُٹھتا ہے۔ میں ایک عام سی گھریلو خاتون ہوں۔ پرویز صاحب سے میرا تعارف طالب علمی کے دور سے ہوا میرے والد صاحب کو شائد سننے کا موقع تو نہ ملا ہو کیونکہ ہماری رہائش اسلام آباد تھی۔ لیکن گھر میں رسالہ طلوع اسلام ضرور دیکھا تھا۔

میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوئی تو ہمسائی دوست سے کچھ پڑھنے کو لے آئی۔ اُس نے مجھے خواتین ڈائجسٹ اور آداب عرض جیسے رسالے پکڑا دیئے۔ ابّا جان نے دیکھا تو بہت ناراض ہوئے۔ اُسی وقت واپس کروائے اور ردّی میں پھکوانے کو کہا اور مجھے اخبار کے اداریے، انگریزی اردو کے مضامین اور طلوع اسلام پکڑا دیا۔ چارو ناچار پڑھتے رہے مگر جب کالج کا دور آیا تو کتاب کے مضامین کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کا انداز سیکھا پھر پڑھنے کا صحیح مزہ آیا۔ ایک مرتبہ کالج کے اسلامی ڈپارٹمنٹ نے ایک مذاکرہ رکھا جس کا عنوان تھا۔ ''کیا اسلامی حدود صرف عورتوں کے لیے؟'' ٹاپک بڑا کانٹے دار تھا۔ ہم نے سوچا بھئی! اس بار مذاکرے کا خوب مزہ آئے گا۔ بڑی دھواں دھار تقاریر سننے کو ملیں گی۔ لیکن معلوم ہوا اس بار باہر سے کوئی مقرر نہیں ہوگا۔ صرف اسلامک ڈپارٹمنٹ ہی یہ پروگرام پیش کرے گا۔

لو جی! دن گزرتے گئے۔ کوئی بچہ آگے آنے کی جرأت نہ کرے۔ پھر کیا ہوا۔ ایک دن خوب جھاڑ پڑی۔ ہماری غیرت کو للکارا گیا۔ اور آخر ہم نے بھی اپنا نام لکھوا ہی دیا۔

ٹاپک Logic مانگتا تھا۔ مواد اکھٹا کرنا، لکھنا اور پھر اُس کو اتنا جامع بنانا کہ صرف 3 منٹ میں اظہارِ خیال کر کے سٹیج سے اُتر جانا۔ بہرحال کوشش شروع کر دی۔ گھر میں جتنی بھی کتابیں، رسالے تھے سب چھانٹ ڈالے۔ آخر تڑے مڑے دو تین رسالے طلوع اسلام کے بھی اُٹھا لیے۔ چند صفحات ہی پلٹے تو مواد ملنا شروع ہو گیا۔ کانٹ چھانٹ کر کے 3 منٹ میں بولنے کی پریکٹس کی اور جناب! زندگی میں پہلی بار سٹیج پر آ گئے۔ ایک مقرر ماہر ہوتا ہے اور ایک میرے جیسا اناڑی! کانپتے ہاتھوں، لرزتی ٹانگوں سے تقریر کر کے نیچے اُتری تو تالیوں کی گونج سے محسوس ہوا کہ بات بن گئی ہے۔ نتیجہ پہلا نمبر اور یہ کریڈٹ طلوعِ اسلام کو جاتا ہے۔

شادی ہوئی تو لاہور آ گئی۔ یہاں گھرانہ ہی پرویز صاحب کا شیدائی۔ افسوس کہ چند ماہ پہلے ہی اُنکا انتقال ہو گیا تھا۔ صرف ریکارڈنگ ہی دیکھنے سننے کو ملی گو کہ میں ایک Regular سامع نہیں ہوں اور نہ ہی اُن کی کتابوں کا مکمل مطالعہ کیا ہے۔ لیکن جو کچھ بھی سنا اور پڑھا تو دماغ کی بند شریانیں کھلنی شروع ہو گئیں۔ سوچ اور سمجھ کے دھارے بدلنا شروع ہو گئے۔ عقل کو جلاء ملی اور زندگی جو پرانے خیالات میں مقید تھی۔ آزاد ہو گئی۔ معلوم ہوا ہر شخص اپنے اندر ایک جہان ہے۔ اللہ کی تمام صفات کا مظہر ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں مسلسل جدوجہد کر کے ہی اُس ذات کا مظہر بن سکتے ہیں جو رب العالمین ہے اوہو پر کیا کریں کہ سمجھ ہی اب آئی ہے۔ جب۔

اُٹھ فریدا سُتیا تیری داڑھی آیا بور
تیرا اَگا نیڑے آیا پیچھا رہ گیا دور

ہم سب یہاں بظاہر بہت باکردار اور عالم فاضل نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم نکھر کر تب سامنے آتے ہیں جب ہم سے کسی کو وا پڑتا ہے۔ کیا ہم اپنا احتساب ایفورڈ کر سکتے ہیں؟ نہیں! کان لگا کر جی کڑا کر کے دوسروں سے سنیں اور اپنی اصلاح کریں۔ مانا کوئی انسان فرشتہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ کون سا انسان تھا۔ جس کے سامنے فرشتے بھی سجدہ ریز تھے؟

بُرے بندے نوں لبن ٹریا پر بُرا نہ لبھا کوئی
جد میں اندر جھاتی پائی تے میھنوں بُرا نہ کوئی
دیکھ بندیا اسماناں اُتے اڑدے پنچھی
دیکھ تے سہی کی کردے نے
ناں او کردے رزق ذخیرہ
ناں او بکھے مردے نے
کدی کسی نے پنکھ پکھیرو
بکھے مردے دیکھے نے؟
بندے ہی کردے رزق ذخیرہ
بندے ہی بکھے مردے نے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لغات القرآن

ج ھ ل جَھَنَّمُ اور ج و ب

اَلۡجَھۡلُ کے معنے ہوتے ہیں جو امور واضح نہ ہوں ان کی واقفیت حاصل کئے بغیر ان میں پیش قدمی کرنا۔ راغب نے کہا ہے کہ جَھۡلٌ کی تین قسمیں ہوتی ہیں (1) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا (یہ بنیادی معنے ہیں)۔ (2) کسی بات کے متعلق اس کی صحیح کیفیت کے خلاف اعتقاد رکھنا اور (3) کسی بات کو جس طرح کرنا چاہئے اس کے خلاف کرنا۔ خواہ اس کی بابت اعتقاد صحیح ہو یا غلط (تاج)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے (1) علم کی ضد اور (2) ہلکا پن اور بے اطمینانی کے ہیں۔

مَجۡھَلٌ۔ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں نشانات راہ نہ ہونے کی وجہ سے صحیح راستہ نہ مل سکے (تاج)۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلۡجُھُوۡلُ اس سادہ لوح اور ناتجربہ کار آدمی کو کہتے ہیں جو جلد دھوکے میں آجائے (محیط)۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جَاھِلٌ کا لفظ مذمت کے لئے آتا ہے لیکن کبھی اس کے معنے ناواقف کے بھی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں یہ لفظ مذمت کے لئے نہیں آتا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے یَحۡسَبُھُمُ اَلۡجَاھِلُ اَغۡنِیَآءَ (2/273) ''ناواقف انہیں دولتمند سمجھتا ہے''۔

عربوں کے زمانہ قبل از اسلام کے لئے جَاھِلِیَّۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی اس لفظ کا استعمال آیا ہے (مثلاً 33/33)۔ اس کے معنے یہ نہیں کہ وہ لوگ جاہل مطلق تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین سے ناواقف تھے۔ جاہلیت سے مراد ان کی جہالت نہیں بلکہ اس دین سے ناواقفیت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان تک پہنچا۔ لہٰذا رسوم جاہلیت سے مراد وہ رسوم ہی نہیں جو زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں رائج تھیں۔ اس سے مراد وہ تمام غلط اعتقادات اور غیر قرآنی اعمال حیات ہیں جو دین سے ناواقفیت کی بنا پر مسلمانوں میں پھیل رہے ہیں۔ نیز علم ہو جانے کے بعد بھی اسی روش پر جمے رہنا (محض اس لئے کہ وہ روش اسی طرح چلی آرہی ہے) جاہلیت ہے۔ یہ مسلک پتھروں کا ہے جو کسی حالت میں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ اسی لئے بڑی چٹان کو صَفَاۃٌ جَیۡھَلٌ کہتے ہیں (محیط)۔ یہ جہالت و جاہلیت کی بدترین قسم

ہے۔ اسی لئے صاحب تاج العروس نے اسے جَھْلٌ مُرَکَّب سے تعبیر کیا ہے (تاج)۔

احمد امین مصری (مرحوم) نے کہا ہے کہ ''سَلَامٌ کے معنے مسالمت کے ہیں جو جنگ اور مخاصمت کی ضد ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْناً وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوا سَلَاماً- (25/63) میں جَهَالَت کے مقابلہ میں سَلَام کا لفظ لایا گیا ہے۔ غالباً اس آیت کے ذریعہ ہم وہ وجہ معلوم کر سکتے ہیں جس کی بنا پر نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے زمانہ کو جاہلیت کا اور بعثت کے بعد کے زمانہ کو اسلام کا لقب دیا گیا۔ یہ لفظ ''جاہلیت'' اس جَھْلٌ سے ماخوذ نہیں جس کے معنے نہ جاننے (عِلْمٌ کی ضد) کے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ اس ''جَھْلٌ'' سے ماخوذ ہے جس کے معنے سفاہت، غضب اور حمیت کے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ انہوں نے کسی کو اس کی ماں کے نام سے عار دلائی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّكَ اَمْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ۔ ''تمہارے اندر جاہلیت کی روح اب تک موجود ہے''۔ اسی جہت سے عربوں کا محاورہ ہے ''اِسْتَجْهَلَهُ الشَّيْبُ''۔ یعنی اس چیز نے اسے عقل وخرد سے بیگانہ بنا دیا۔ کسی شاعر کا مصرع ہے۔ دَعَاكِ اَلْهَوٰى وَاسْتَجْهَلَتْكَ الْمَنَازِلُ۔ محبت نے تجھے پکارا اور محبوب کے مکانوں نے تیرے حواس گم کر دیئے۔ عمرو بن کلثوم کے معلقہ میں ہے۔

اَلَا لَا يَجْهَلَنْ اَحَدٌ عَلَيْنَا
فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ
الْجَاهِلِيْنَا

خبردار کوئی ہمارے خلاف زیادتی نہ کرے ورنہ ہم زیادتی کرنے والوں سے بڑھ کر زیادتی کرینگے۔ ان استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جَاهِلِيَّةٌ کا لفظ ہلکے پن، عقل وہوش سے بیگانگی، عصبیت، حمیت اور مفاخرت وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا تھا جو اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی کا اہم ترین عنصر تھا۔ اسی لئے اس زمانہ کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ان معانی کے بالمقابل سکون نفس، تواضع، اعمال صالحہ کی اہمیت کا احساس اور نسلی فخر وغرور کی بے اعتباری وغیرہ کے رجحانات، سلامتی اور مصالحت کے ہوتے ہیں۔'' (فجر الاسلام، ص 70-69)۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی نہجِ زندگی کیا ہے اور جاہلیت کی روش کیا؟

قرآن کریم کی رو سے علم حاصل نہ کرنا جرم ہے اور علم حاصل ہو جانے کے بعد اپنی غلط روش میں تبدیلی نہ

کرنا اس سے زیادہ سنگین جرم (مزید تفصیل ع۔ل۔م اور ع۔ق۔ل کے عنوانات میں ملے گی)۔ سورۃ بقرہ میں یہ لفظ ھُزُوٗ کے ساتھ آیا ہے (2:67) لہٰذا اس کے معنے ہیں وہ لوگ جو زندگی کے مسائل اور احکام وقوانین کو سنجیدگی سے (Seriously) نہ لیں۔ انہیں مذاق ہی سمجھیں۔

❁❁❁

جَهَنَّمُ

جَهَنَّمُ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عربی لفظ ہے جس کے معنے ہیں گہرا۔ کہتے ہیں "رَكِيَّةٌ جَهَنَّمٌ"۔ "گہری تہ والا کنواں"۔ بعض نے اسے عبرانی لفظ **گهنَّامُ** سے معرب مانا ہے (تاج)۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ عبرانی الاصل ہے اور دو لفظوں سے مرکب۔ **جِیْ هَنُّومُ** یروشلم کے جنوب میں ایک مشہور وادی تھی جس میں زمانہ قدیم میں مولوک (**عَمُّوْنِیِّیْن** کے دیوتا) کے حضور آدمیوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی۔ لہٰذا **جِیْ هَنُّومُ** سے مراد تھی وہ وادی جہاں انسان ذبح کئے جاتے تھے اور انہیں جلایا جاتا تھا (محیط' نیز غریب القرآن میرزا ابوالفضل)۔ اس اعتبار سے **جَهَنَّم** کا ترجمہ انسانیت کی قربانگاہ ہوگا۔ خدا کے قانون ربوبیت کا منشا یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ انسانیت برومند اور ثمر بار ہو۔ ایسا معاشرہ جس میں انسانیت نشوونما پائے جنتی معاشرہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ معاشرہ جس میں انسانیت ذبح ہو جائے اور جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے **جَهَنَّمی** معاشرہ ہے۔ اس کے لئے عربی لفظ **جَحِيْمٌ** ہے جس کے معنے روک دینا ہیں (دیکھئے عنوان ج ح م)۔ یعنے جس مقام پر انسانیت کی نشوونما رک جائے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں **جَهَنَّم** کے متعلق کہا ہے: **وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِيْنَ حَصِيْراً** (17/8)- جہنم ان لوگوں کے لئے روک کا مقام ہے جو قانون خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں۔

چونکہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے جس کی نشوونما یہاں رک جاتی ہے وہ زندگی کی اگلی منزلیں طے کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے اس زندگی میں بھی وہ **جَهَنَّم** میں رہتا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس زندگی میں **جَهَنَّم** کی کیفیات کیسی ہوں گی' اس کے متعلق ہم آج کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ موجودہ زندگی میں **جَهَنَّم** کا عذاب ہم ہر وقت محسوس کر سکتے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ اجتماعی طور پر جو قوم غلط راستے پر چلتی ہے اس کی سعی وعمل ثمر بار ہونے کی بجائے جل کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ یہ **جَهَنَّم** ہے۔ اور اس کا

نتیجہ ذلت و رسوائی۔ اس کی تفاصیل قرآن کے مختلف مقامات میں ملیں گی۔ اسی طرح اس معاشرہ میں رہنے والے افراد کے جوہر انسانیت جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہنم' انسان کے اپنے اعمال ہی سے بنتی ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ: وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ- (29/54) ''یقیناً جہنم کفار کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے''۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (82/16)- یہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں۔ وہ انہیں اب بھی دیکھ رہی ہے۔ ان کے سامنے ہی ہے' لیکن ان کا عدم احساس اسے ان کی نظروں سے اوجھل کئے ہوئے ہے۔ جب ان کی آنکھیں کھل جائیں گی تو وہ ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَى (79/36)- وہ دیکھنے والے کے لئے ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ لوگ اس میں ''یوم الدین'' میں داخل ہوں گے يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ (82/15)- يَوْمَ الدِّينِ ظہورِ نتائج کا زمانہ ہے' اس دنیا میں یا مرنے کے بعد۔

ج و ب

اَلْجَوْبُ۔ قطع کرنا۔ پھاڑنا۔ سوراخ کرنا۔ یہ اس مادہ کے اصلی معنے ہیں (تاج)۔ قرآن کریم میں ہے وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (89/9)- اور ثمود جو وادی میں پہاڑوں کی چٹانوں کو تراش کر (اپنے مکان بناتے تھے)۔ اَلْجَوْبَةُ۔ مکانات کے پچھواڑے جو گڑھا سا بن جائے جس میں بارش کا پانی جمع ہو جائے (تاج)۔ اَلْجَوْبُ ڈھال کو بھی کہتے ہیں (تاج)۔

اَجَابَ۔ يُجِيبُ۔ اِجَاباً و اَجَابَةً۔ جواب دینا۔ (اس لئے کہ جواب دینے والا جب کسی کی بات کا جواب دیتا ہے تو وہ اس کے منہ سے نکل کر سائل کے کانوں تک کا فاصلہ قطع کرتی ہے۔ ویسے سوال بھی یہ فاصلہ طے کرتا ہے لیکن یہ لفظ جواب کے لئے خاص ہو گیا ہے۔ راغب)۔ اس سے اسمِ فاعل مُجِيبٌ ہے۔ جواب دینے والا۔ قرآن میں ہے إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ (11/61)- ''یقیناً میرا رب قریب ہی ہے اور بات کا جواب بھی دیتا ہے۔'' سورۃ بقرہ میں ہے أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (2/186)- ''میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔'' دعا اور خدا کی طرف سے اس کے جواب کے صحیح مفہوم کے لئے (د۔ع۔و) کا عنوان دیکھئے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ دُعا سے مفہوم ہے خدا کے قوانین کا اتباع کرنا اور اس کی طرف سے جواب کے معنی ہیں ان قوانین کا نتیجہ خیز ہونا۔ چنانچہ سورۃ المومن میں ہے: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (40/60)- ''تمہارا

نشوونما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔'' اس کے بعد ہے: إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (40/60)- جولوگ میری اطاعت گزاری سے سرکشی برتتے ہیں وہ ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' اسی پوری آیت سے واضح ہے کہ دعا درحقیقت ''يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي'' کی ضد ہے۔ لہٰذا دعا سے مقصود خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اسی لئے اس سے ذرا پہلے ہے وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ (40/50)- ''جولوگ قوانین خداوندی سے انکار کرتے ہیں ان کی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔'' یہی وجہ ہے کہ سورۃ بقرہ میں جہاں یہ کہا ہے کہ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (2/186)- ''میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں'' تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي (2/186)- ''لہٰذا انہیں چاہئے کہ میرے قوانین پر ایمان رکھیں اور میری اطاعت کریں'' یہ لوگ یہ کچھ کریں اور میں ان کی سعی وعمل کو نتیجہ خیز کروں گا۔ یہ ہے دعا اور اجابتِ دعا کا قرآنی مفہوم۔ یعنے جو کچھ خدا کے تقاضے ہیں انہیں تم پورا کرو۔ جو کچھ تمہارے تقاضے ہوں گے خدا انہیں پورا کردے گا۔ یہی خدا کا قانون ہے۔ جو شخص حسن کارانہ انداز سے اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے وہ اس کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ-(11/115) ''اور استقامت سے جما رہ۔ بے شک اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔'' اور کوشش کے بغیر کچھ ملتا نہیں۔ وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (53/39)- ''انسان کے لئے کچھ نہیں بجز اس کے جس کے لئے وہ کوشش اور محنت کرے۔''

سوال دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو کسی بات یا مسئلہ کا دریافت کرنا اور دوسرے امداد واعانت طلب کرنا۔ لہٰذا اس اعتبار سے جواب کی بھی دو قسمیں ہوں گی اور اجابت واستجابت' ان دونوں قسموں کے جواب کے لئے بولا جائے گا۔ یعنی کسی سوال کا جواب دینا' یا کسی مانگ اور مطالبہ کو پورا کردینا۔

❁❁❁

سانحہ ارتحال

چوہدری ممتاز احمد سابق اکاؤنٹینٹ طلوع اسلام ٹرسٹ کے بھائی چوہدری ریاض احمد گذشتہ دنوں وفات پاگئے ہیں۔ طلوع اسلام کے ساتھ ان کی دیرینہ وابستگی تھی۔ بزم طلوع اسلام لاہور کے فعال ممبر تھے دعا ہے کہ اللہ تبارک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل۔ ادارہ ممتاز صاحب اور مرحوم کے دیگر اعزہ اقربا کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

تعارف

مفہوم القرآن سوفٹ ویئر

میں یہ مضمون آپ کی توجہ حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ میں اپنے اندر اس تبدیلی کو محسوس کر رہا ہوں جو عصرِ حاضر کے عظیم دانشور محترم علامہ غلام احمد پرویز کی آڈیو، ویڈیو کیسٹس اور ان کی معنی خیز تحریروں کی وجہ سے ہے، ان کی تصانیف وجوہات اور مقاصد سے بھرپور۔ سمجھانے کے عمدہ انداز نے دورانِ مطالعہ مجھے قائل کر دیا کہ قرآن کے متعلق اور کچھ کیا کہا جا سکتا ہے۔

آج کے جدید دور میں اسلام کا حقیقی اور اساسی تصوّر علامہ پرویز کی عظیم الشان تحریروں سے اجاگر ہوا ہے۔ بلا شبہ ان کی شخصیت گزشتہ ہزار سالہ دور میں نمایاں اور منفرد مقام پر آتی ہے۔

ابتداً خود پرویز صاحب مفہوم القرآن، لغات القرآن کو اپنی تحریروں کے تسلسل کی آخری کڑی سمجھتے تھے، مگر بعد میں انہوں نے محسوس کیا کہ یہ سلسلہ تبویب القرآن کے بغیر نامکمل رہے گا۔

عام طور پر پی ڈی ایف، یا ای بکس کا مقصد پڑھنا یا اسے پرنٹ کر لینے کے لئے جاتے ہیں۔ علامہ پرویز کی تحریروں سے کماحقہٗ استفادہ حاصل کرنے کے لئے مختلف کتابوں کے کئی ایک حوالہ جات کو مدِ نظر رکھنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ مضامین کا آپس میں گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے قرآنی مواد (مفہوم القرآن) قرآنی ڈکشنری (لغات القرآن) اور قرآنی انسائکلوپیڈیا (تبویب القرآن) لغوی سیاق وسباق اور معنویاتی معلومات قرآن کریم کے مطالب کا کلیتاً احاطہ کرنے کے لئے لاینفک ہیں۔

قرآنِ کریم کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے والے اس بات کی ضرور قدر کریں گے کہ (مفہوم القرآن)، قرآنی ڈکشنری (لغات القرآن) اور قرآنی انسائیکلوپیڈیا (تبویب القرآن) سے بیک وقت براہِ راست استفادہ کرنا کس قدر عرق ریزی، محنت طلب اور یکسوئی کا کام ہے۔

اکیسویں صدی میں مطالعہ صرف چھپی ہوئی کتابوں کا مرہونِ منت نہیں رہا۔ مطالعاتی عادات تبدیل ہو رہی ہیں۔ مطالعہ خود ارتقاء پزیر ہے۔ انٹرنیٹ کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے مطالعہ بھی تغیر کا شکار ہے۔ ڈیسک ٹاپ اور سمارٹ فون کے ایپلیکیشن، رابطے اور مطالعہ کی فراخی۔ بغیر سمجھے قرآن کے مطالعے کی کثرت۔ اس کی حقیقی تعلیم سے پہلوتہی۔ یہ رویہ آج تبدیل ہو رہا ہے اور تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان قرآن کی طرف لوٹ رہا ہے۔

موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کے جلد از جلد اس کا سدّ باب کیا جائے اور جامد علوم کو عصرِ حاضر کے مطابق اسے سافٹ ویئر کی شکل میں ڈھال دیا جائے۔ تاکہ پی ڈی ایف اور ای بکس کے تراجم تحریف سے مبّرا ہو جائیں اور اس کی جگہ تحقیقی افراد،

طالب علموں، سچائی کے متلاشیوں، جو قرآن کو اس کے حقیقی معنوں سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور اپنی زندگیوں کو اس کے قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ مروجہ معانی کے بجائے زندگی کی عملی تعمیر نو کی جا سکے۔ نتیجتاً وہ اس قابل ہو جائیں کہ قرآن کے بے سمجھی کے مطالب کے رویے کو مغلوب کر سکیں۔

مفہوم القرآن کے سافٹ ویئر کو اس لئے بھی ڈیویلپ کرنا مقصود تھا کہ اس سے قرآنی مواد (مفہوم القرآن) قرآنی ڈکشنری (لغات القرآن) اور قرآنی انسائیکلوپیڈیا (تبویب القرآن) کو یک جا کر کے اسے مربوط نظریہ سے جوڑ دیا جائے اور ایک مفہوم القرآن نام کی ایپلیکیشن تشکیل دی جا سکے۔

بزم طلوع اسلام کراچی نے مفہوم القرآن سوفٹ ویئر پروجیکٹ کا آغاز وسط 2013 میں کیا۔ اس کے لئے مخصوص افراد کی ایک ٹیم تشکیل دی جس نے پہلے مرحلے میں مفہوم القرآن اور لغات القرآن کو کتابی شکل سے ڈیجیٹل ڈیٹا میں تبدیل کیا۔ اس کے بعد اس تمام مواد کو دو مزید مرحلوں یعنی پروف ریڈنگ اور اغلاط کی تصحیح سے گزارا گیا۔ بعد ازاں ایک سوفٹ ویئر ڈیولپر ٹیم کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ مفہوم القرآن کا سوفٹویئر اور ویب پیج ڈیزائین کیا جا سکے۔ اس کی ابتدائی حیثیت سے مطالعہ اور سفارشات کے لیئے ویب موجود ہے۔ ویب ایپلیکیشن پر کام تیزی سے جاری ہے اور جلد تکمیل تک پہنچ جائے گا۔

مستقبل قریب میں اسے موبائیل فون پر کثیر جہتی انداز یعنی انڈرائیڈ سے ونڈوز وغیرہ کی سہولت کے ساتھ پیش کیا جائے گا تاکہ وسیع پیمانے پر افراد کی کثیر تعداد استفادہ حاصل کر سکے۔

سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ علامہ پرویز کا کام (تقریباً پچاس سے زیادہ کتب) گیارہ زبانوں میں منتقل (ترجمہ) ہو چکا ہے۔ اسی لئے سافٹ ویئر پروجیکٹ کی اہمیت بڑھ گئی ہے جو ایک دن اس سلسلے میں بے حد مددگار ثابت ہوگا۔ جبکہ انگریزی عصر حاضر میں بے پناہ سہولتوں کے ساتھ بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔

یقیناً سوفٹ ویئر بین الاقوامی طور پر لیے ایک انتہائی موثر ذریعہ ہوگا۔ انگریزی اور اردو زبانوں کے امتزاج سے دنیا بھر کے لوگوں کے لئے بے پناہ معلومات تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

مفہوم القرآن انگریزی (Exposition of the Holy Quran) کی سافٹ کاپی موجود ہے اور اسے سافٹ ویئر کا حصّہ بنایا جا رہا ہے مگر لغات القرآن کا انگریزی ترجمہ (جس کو کتابی شکل میں شائع بھی کیا جا چکا ہے) کی سافٹ کاپی ہمیں اب تک مہیا نہیں کی گئی۔

ہماری انتہائی مستعد ٹیم تبویب القرآن کے مواد پر کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ اسی دوران اگر لغات القرآن کا انگریزی ترجمہ موصول ہو گیا تو اسے بھی سوفٹ ویئر کا حصہ بنا دیا جائے گا۔

مفہوم القرآن سوفٹ ویئر کے کچھ نمایاں خدوخال درج ذیل ہوں گے۔

1۔ انٹرنیٹ، ڈیسک ٹاپ اور سمارٹ فون ایپلیکیشنس، مختلف قسم کا مواد جو مختلف مآخذ میں موجود ہے استعمال کرنے والے کو ایک ہی جگہ حاصل ہو سکے۔

2۔ انٹرنیٹ پر کسی خاص موضوع کی تلاش کے لئے ایک مشترکہ ڈھانچہ نہایت باریک بینی سے تشکیل دیا گیا ہے۔ تاکہ دورانِ استعمال بغیر کسی دقت، آسانی اور قدرتی انداز سے مشاہدہ کیا جا سکے۔ دوران استعمال آپ کے سامنے بے شمار ترجیحی تحقیقاتی راستے موجود ہوں گے۔ اور انکا بیک وقت مشاہدہ کیا جا سکے گا۔

3۔ آن لائن ڈیجیٹل قرآن کی اہمیت اور دنیا بھر میں قرآن کو آن لائن سیکھنے کا رجحان۔

4۔ معلومات کی تیز ترین اور وسیع ترین ذریعہ کی چابی۔

5۔ آئی ٹی کی کئی ایک ایپلیکیشنس کا ایجاد ہونا جس سے قرآن سے با آسانی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

6۔ اہم جز اور اشکال کی نشان دہی جو قرآنی تحقیق کے دوران ممد و معاون ہوں۔

7۔ قرآنی لفظ در لفظ، لفظی مادہ اور لغات القرآن کے ساتھ انضمام۔

8۔ لفظوں اور ان کے مادوں کی لغات القرآن میں تلاش۔

9۔ مفہوم القرآن اور ایکسپوزیشن کی آیات کا براہ راست اور بیک وقت سامنے آنا بھی قابل تلاش ہوگا۔

10۔ ایسی آیات جو ایک ہی مادہ پر مشتمل الفاظ پر مبنی ہوں لغات القرآن میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

11۔ ایسے الفاظ جو ایک ہی مادہ پر مشتمل ہوں لغات القرآن میں یک جا دیکھے جا سکتے ہیں۔

12۔ مکمل آیت تمام الفاظ کے ساتھ اور آیت کا ہر لفظ اپنے مادہ کے ساتھ لغات القرآن میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

13۔ اس فیچر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ قرآنی آیات، مفہوم القرآن اور ایکسپوزیشن، الفاظ کے مادہ یعنی لغات القرآن میں مختلف زبانوں میں تلاش کی سہولت موجود ہے۔

14۔ مطلوبہ سورۃ یا متعدد آیات کو فلٹر کر کے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

15۔ قرآن میں تلاش کے لئے مختلف پیرامیٹرس مثلاً آیت نمبر، سورۃ کا نام یا لفظ کے مادہ کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے۔

16۔ ابتدائی خاکہ اور اس کی تشکیل مع تلاش کرنے کی تمام ضروری سہولتیں مثلاً پڑھنا، تحقیق، موبائل ایپلیکیشنس اور انٹرنیٹ، مفہوم القرآن اور لغات القرآن کے گرد مکمل احاطہ زیر تکمیل و تعمیر ہے۔

17۔ زبانوں کی باہم تلاش میں انگریزی اور اردو سے عربی، لفظ کا مادہ، مفہوم القرآن، لغات القرآن۔ ایکسپوزیشن کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

18۔ ویب بیسڈ ایپلیکیشن کی تشکیل جیسا کہ قرآنک معلومات تک رسائی زیرِ تعمیر ہے۔

19۔موبائل فون سیل کے لئے سہولت کی تیاری جیسے ونڈوز اور انڈرائڈ کی ایپلیکیشن جسے مستقبل قریب میں فعال کر دیا جائے گا۔

20۔اس میں اس بات کی بھی صلاحیت ہوگی کہ آپ عام معانی اور خصوصی معانی میں تفریق کر سکیں۔

22۔مختلف تراجم کے تقابل کی سہولت بھی مہیا کی جارہی ہے جو کہ تشکیل کے مراحل میں ہے۔

22۔تبویب القرآن عنوانات اور ذیلی عنوانات کے ساتھ ساتھ متعلقہ آیات مع ہر لفظ کا مادہ (لغات القرآن) بھی سامنے آجائیں گی اس کی بھی تشکیل جاری ہے۔

23۔مفہوم القرآن سوفٹ ویئر ڈیسک ٹاپ میں ڈاون لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ سی ڈی پر بھی مہیا ہوگا تا کہ آف لائین بھی کمپیوٹر پر کاپی کیا جا سکے۔

24۔مختلف لغات (قرآنی ڈکشنریز) جیسے کہ لین اور دوسرے تراجم کے لنک بھی مہیا کیے جائیں گے تا کہ تقابلی مطالعہ کیا جا سکے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی مفہوم القرآن کا سوفٹ ویئر استعمال کرتے ہوئے، تبویب القرآن میں "اجر" کے عنوان کے تحت اور ذیلی عنوانات کو دیکھنا چاہے تو بغیر وقت اور نہائت قلیل وقت میں دیکھ سکے گا۔ظاہر ہے کہ یہ مفہوم القرآن، لغات القرآن اور تبویب القرآن کا ایک مربوط سلسلہ ہے اور ایک دوسرے سے منسلک ہے۔

''اجر۔ایمان وتقویٰ کا اجر''

''اجر۔ایمان واعمال صالح (یا مومنین) کا اجر''

''اجر۔کسی کا اجر ضائع نہیں ہوتا''

''اجر۔انبیائے کرامؑ اجر نہیں مانگتے تھے''

''اجر متفرق''

میں ساری ٹیم اور خاص طور پر محترم اقبال صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے تمام مشکلات کی پروا کئے بغیر نہائت استقامت اور انتھک محنت سے اس دیرینہ خواہش اور خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں بھرپور ساتھ دیا۔

شہاب آفتاب

ٹیم لیڈر

سوفٹویئر ڈیولپمینٹ پروجیکٹ

بزم طلوع اسلام کراچی۔

◆◆◆

ادارہ

باب المراسلات

کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟

ایک صاحب لاہور سے دریافت فرماتے ہیں۔

آیا انسان کی موت کا وقت پہلے سے ہی متعین ہوتا ہے؟

یعنی اس عالمِ کون وفساد میں ہر متنفس کا عرصۂ حیات خدائے عزّ وجل کی طرف سے مقدر کر دیا گیا ہے اور اس میں کم وبیش نہیں ہوسکتا۔ یا مرگ وزیست حالات وحادثاتِ دہر کے تابع ہوتے ہیں۔

بعض اوقات کسی مریض کے علاج میں کوتاہی، مریض کا اخفائے مرض، مناسب طبی امداد کی عدم موجودگی، غلط تشخیص وغیرہ موت کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان حالات میں کیا سمجھنا چاہئے کہ متوفی کا عرصۂ حیات ہی اسی قدر تھا یا اس کا مناسب علاج ہوتا تو وہ زندہ رہ سکتا تھا۔

یا مثلاً ایک شخص سات بجے صبح تندرست وتوانا جہاز میں سوار ہوتا ہے اور سات بج کر 15 منٹ پر ہوائی حادثہ کی وجہ سے ہلاک ہوجاتا ہے۔ کیا وہ جہاز پر سوار نہ ہونے سے بچ سکتا تھا؟

صلہ رحمی، صدقات وخیرات سے عمر بڑھ سکتی ہے اور مرض الموت سے نجات مل سکتی ہے یا یہ محض توہمات ہیں؟

طلوعِ اسلام:

یہ سوال دراصل مسئلہ تقدیر سے متعلق ہے، اور تقدیر کا مسئلہ وہ ہے جس کے متعلق غلط تصور نے مسلمانوں کو برباد کر رکھا ہے۔ تقدیر کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اس کے متعلق ہر دور میں کتابوں کے انبار کے انبار لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی پیچیدگیاں حل ہونے میں نہیں آئیں۔ محترم پرویزؔ صاحب نے اپنی کتاب ''من ویزداں'' میں اس [1] موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا مطالعہ بہت سے اشکال کو رفع کر دیتا ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ یہ سوال انسان کی عمر پہلے سے متعین ہے، یا یہ گھٹ بڑھ سکتی ہے، اسی اصولی مسئلہ کے متعلق ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے یا اسے اختیار وارادہ بھی حاصل ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب باب المراسلات میں ضمنی طور پر

[1] ''من ویزداں'' میں ''مشیت'' کے عنوان کے تحت اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ نیز اس موضوع پر مبسوط تصنیف کتاب التقدیر شائع ہوچکی ہے

نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے ہم اس اصولی سوال کے متعلقات وتضمنات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اسی نکتہ کے متعلق کچھ صراحت کریں گے۔ کہ انسان کی عمر پہلے سے متعین ہے یا گھٹ بڑھ سکتی ہے؟

سورۂ آل عمران میں ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔ (3/145)

اس کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے کہ:

''کسی شخص کے لیے یہ نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مرجائے۔ موت کا مقرر وقت لکھا ہوا ہے۔''

اور اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ:

موت کا ایک دن معیّن ہے۔

اس لیے نہ تو انسان کی احتیاط اور تدبیر اس وقت معیّن کو مؤخر کرسکتی ہے اور نہ ہی اس کی بے احتیاطی قبل از وقت موت لاسکتی ہے۔ اس عقیدہ کا اثر یہ ہے کہ لوگ عام طور پر اپنی صحت سے لاپروائی برتتے ہیں۔ بیمار ہوجاتے ہیں تو اوّل تو علاج ہی نہیں کرتے، اور اگر علاج کرتے ہیں تو بڑی بددلی سے۔ متعدی امراض کے متعلق کبھی احتیاط نہیں برتتے اور جب بھی ان سے اس کے متعلق کہا جائے تو جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ موت اور بیماری سب پہلے سے لکھی ہوئی ہے انسان کی کوئی تدبیر اس لکھے کو مٹا نہیں سکتی۔ اگر موت آنی ہے تو ہزار تدبیروں کے باوجود آکر رہے گی، اور اگر اس کا وقت نہیں آیا تو انسان جس قدر بداحتیاطی چاہے کرے اسے کوئی نہیں مارسکتا۔ لیکن یہ تصوّر قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ ہر شخص جو پیدا ہوا ہے اسے موت ضرور آئے گی۔ لیکن اس نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ موت کب آئے گی۔ اس لئے ہر شخص کی موت کا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ مرجاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے قانون نے ہر چیز کے اثرات کے اندازے مقرر کردیئے ہیں۔ آگ کے سامنے ہاتھ رکھو تو وہ (سردی کے موسم میں) خوشگوار گرمی پہنچائے گی۔ لیکن اگر اس کے اندر ہاتھ ڈال دو۔ تو ہاتھ جل جائے گا۔ پانی کا ایک گلاس ہو تو وہ زندگی عطا کرے گا، لیکن جب اسی پانی میں ڈوب جاؤ تو اس سے موت واقع ہوجائے گی۔ سنکھیا کی بوندیں (طبی اصولوں کے مطابق) کھاؤ تو وہ کئی امراض کو فائدہ دے گا۔ لیکن اگر اس کی ڈلی نگل جاؤ تو اس سے ہلاکت واقع ہوجائے گی۔ یہ ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اسی طرح موت کے پیمانے مقرر کردیئے ہیں۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ۔ (56/60)

ہم نے تمہارے درمیان موت کے پیمانے مقرر کر دیئے۔

یہ پیمانے ایسے قوانین کے مطابق متعین ہوئے ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی چیز کو قرآن نے دوسرے مقامات پر کتاب مؤجل کہا ہے۔ کتاب کے معنی قانون ہیں اور مؤجل کے معنی مقرر کردہ۔ یعنی یہ خدا کا مقرر کردہ قانون ہے کہ فلاں چیز سے ہلاکت ہوگی اور فلاں سے زندگی ملے گی۔ اس کے بعد قرآن نے کہہ دیا کہ یاد رکھو۔

لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ۔(2/195)

اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔[1]

اگر موت کا وقت پہلے ہی سے مقرر ہوتا تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یہی وہ حکم ہے جس کی رو سے خودکشی حرام قرار پاجاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خودکشی کی ایک صورت تو وہ ہے جس میں انسان اپنا خاتمہ چند لمحوں میں کر لیتا ہے۔ لیکن اس کی دوسری شکل وہ بھی ہے جس میں انسان آہستہ آہستہ خودکشی کرتا ہے۔ مثلاً اگر تپ دق کا مریض اپنی صحت اور بیماری کے علاج سے لاپروائی برتتا ہے تو وہ تدریجی خودکشی کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

قرآن علم الطب کی کتاب نہیں کہ وہ انسانی امراض اور ان کے علاج سے بحث کرے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ایسے اشارات دے دیئے ہیں جن سے توجہ اس طرف منعطف ہوجاتی ہے کہ ایسے کاموں سے اجتناب برتنا چاہئے جن سے امراض پیدا ہوتے ہیں اور جب امراض پیدا ہوں تو ایسی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں جن سے شفا ملتی ہے مثلاً اس نے ایک عام اصول بیان کیا ہے کہ:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔(7/31)

کھاؤ پیو، لیکن زیادتی نہ کرو۔

یہ صحت کا بنیادی اصول ہے۔ دوسری طرف مثلاً شہد سے متعلق کہا ہے کہ:

فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔(16/69)

اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر موت اور مرض کو ایک مقررہ وقت پر آنا ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی تو پرہیز اور علاج سے متعلق ان ہدایات کی ضرورت ہی کوئی نہیں تھی۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ مرض اور موت کے لیے قانون مقرر ہیں۔ یہ چیزیں ان ہی قوانین

[1] اگرچہ یہ آیت اجتماعی موت اور حیات کے قانون سے بحث کرتی ہے لیکن انفرادی موت اور حیات بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔

کے مطابق چلتی ہیں۔ لہٰذا ایک خاص قانون کے مطابق عمر گھٹ جاتی ہے اور دوسرے قانون کے مطابق عمر بڑھ جاتی ہے۔ سورۂ فاطر میں اس کی تصریح موجود ہے جہاں فرمایا کہ:

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ۔ (35/11)

نہ کسی کی عمر بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے مگر قانون کے مطابق۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قانون کے مطابق عمر لمبی ہوتی ہے اور قانون ہی کے مطابق کم ہوتی ہے اور قانون یہ ہے کہ بے احتیاطی سے عمر کم ہوتی ہے اور احتیاط سے عمر بڑھ جاتی ہے۔

سطورِ بالا میں ہم نے ''عمر گھٹنے'' اور ''عمر بڑھنے'' کے الفاظ رواج عامہ کے مطابق استعمال کیے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے گھٹنے اور بڑھنے کے الفاظ صرف اس وقت استعمال کیے جاسکتے ہیں جب پہلے عمر کو متعین شدہ فرض کرلیا جائے۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے عمر کے متعین ہونے کا تصور ہی صحیح نہیں۔ جسم کی مشینری خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق چلتی ہے اور اس قانون کی خلاف ورزی سے رک جاتی ہے۔ انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو خدا کے قانون کی خلاف ورزی بھی کرسکتا ہے۔ اسی قانون کی خلاف ورزی سے یہ مشین چلنے سے رک جاتی ہے۔ کبھی بتدریج اور کبھی یک لخت۔ اب یہ انسان کے اختیار میں ہے کہ جی چاہے تو اس قانون کی خلاف ورزی سے اس چلتی گاڑی کو روک دے اور جی چاہے تو ان قوانین کے اتباع سے عمر طبعی تک پہنچ جائے۔ یاد رکھیے موت کا وقت مقرر نہیں قانون مقرر ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ صدقات وخیرات سے بیماری رفع ہوسکتی ہے اور موت ٹل سکتی ہے یا نہیں۔ تو یہ ظاہر ہے کہ جسم کی مشینری خدا کے طبعی قوانین کے مطابق چلتی ہے۔ اس پر غیر طبعی افعال کا براہِ راست اثر نہیں ہوتا۔ البتہ صدقہ وخیرات وغیرہ، غیر طبعی افعال کا اثر مریض پر نفسیاتی طور پر ہوتا ہے اور نفسیاتی اثر (Psychological) سے مریض کی قوتِ مدافعت بڑھ جاتی ہے جس سے بیماری کے رفع ہونے میں مدد ملتی ہے۔ یہ نفسیاتی اثر عقیدہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ اگر عقیدہ نہ رہے تو پھر اس کا اثر بھی نہیں رہتا۔ ہمیں قرآن سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ یہ عقیدہ جھاڑ پھونک گنڈے تعویذ کے عقائد کے قبیل سے ہے۔ جو انسان کے دورِ سحر (Magic age) کی یادگار ہے۔ قرآن ان توہم پرستیوں سے بہت بلند ہے۔ وہ عقل وبصیرت اور قوانین وضوابط سے بات کرتا ہے۔ نفسیاتی فریب کے الجھاؤ میں نہیں الجھتا۔

نماز

محمد ارشد شیخوپورہ سے لکھتے ہیں:

''نماز بھی دین اسلام کا ایک بنیادی ستون ہے اور یہ ایک بہت بڑا پیکج ہے یہ ہمیں روزمرہ کے معمولات کو سرانجام دینے کے لیے رہنما اصول فراہم کرتا ہے مثلاً جس طرح ہم نماز میں صفیں سیدھی رکھتے ہیں یہاں پر صرف صفیں ہی سیدھی نہیں رکھنی بلکہ اپنے معاملات بھی سیدھے رکھنے ہیں نماز ہمیں مساوات کا بھی درس دیتی ہے جس طرح مسجد میں امیر غریب سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اس طرح یہ مساوات یا برابری اپنے معاشرے میں بھی قائم کرنی ہے اور طبقاتی تقسیم کا خاتمہ لازمی ہے۔ جب کسی کے وسائل میں کمی کے سبب سے اس کی زندگی عدم مساوات کا شکار ہو جائے تو اس کو پھر سے وسائل فراہم کر کے مساوات کے دائرے میں لانا ہے۔

جس طرح ہم وضو کر کے پاک اور صاف ہو کر مسجد میں جاتے ہیں یہ صفائی کا معیار اپنے معاشرے میں بھی قائم رکھنا ہے اپنا گھر گلیاں محلے اور ملک کو بھی صاف ستھرا رکھنا ہے خارجی صفائی کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات کو بھی پاکیزہ اور صاف رکھنا ہے۔

جس طرح ہم نماز میں ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہم مسجد سے باہر جا کر دوسروں کے دکھ درد میں اور اجتماعی مفاد کی خاطر کندھے سے کندھا ملا کر شانہ بشانہ اپنے جان مال کی پروا کیے بغیر ساتھ دیں گے۔

جس طرح ہم مسجد میں ایک دوسرے سے محبت، خلوص اور شائستگی سے پیش آتے ہیں ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔ نماز ہمیں یہ بھی درس دیتی ہے کہ مسجد سے باہر جا کر بھی اسی یکجہتی کا مظاہرہ کریں۔

جس طرح ہم نماز میں ڈسپلن کا مظاہرہ کرتے ہیں اس طرح کا ڈسپلن ہماری عملی زندگیوں میں بھی آنا چاہئے اور جس طرح ہماری نمازیں میں مقرر کردہ وقت میں ہوتی ہیں اس طرح ہمارے روزمرہ کے معمولات بھی ٹائم ٹیبل کے تحت ہونے چاہئیں تاکہ ہم کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام سرانجام دے سکیں۔

اور جس طرح ہم نماز میں اتحاد، اتفاق کا مظاہرہ کرتے ہیں یہ اتفاق باہر بھی نظر آنا چاہئے اور ہمارا یہ زبردست اتحاد ایک حکومت

کے قیام کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے تاکہ ہم وسیع پیمانے پر لوگوں کے مسائل حل کر سکیں۔ نماز فجر اور نماز عشاء ہماری اس طرف بھی رہنمائی کرتی ہے کہ ہم آرام کم سے کم کریں دن کو بڑا کریں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندہ حُر کے لئے جہاں میں فراغ!

نماز ہمیں انفرادی زندگی سے نکال کر اجتماعی زندگی کی طرف بھی لاتی ہے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

پانچ وقت کی نمازیں ہماری اس طرف بھی رہنمائی کرتی ہیں کہ ہم میں زیادہ سے زیادہ رابطہ Communication ہو جس سے عام لوگوں کے مسائل اجاگر ہوں اور پھر ان کا کوئی سد باب کیا جا سکے۔ جس طرح ہم نماز میں خدا تعالیٰ کے سامنے سر بسجود ہوتے ہیں یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہم عملی زندگی میں بھی خدا تعالیٰ کے احکام، قوانین اور اصولوں کو پیش نظر رکھیں گے۔ اپنی خواہش نفس کی پیروی کی بجائے وحی خداوندی (قرآن کریم) کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے۔ اگر ہم نے درج بالا اصولوں ضابطوں کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنا لیا تو ہماری نمازیں نتیجہ خیز ہوں گی اور اس دنیا میں بھی ایک جنتی معاشرے کا قیام ممکن ہو سکے گا۔

جس طرح قرآن کریم کی سورۃ اعراف کی آیات نمبر 170 میں ہے مفہوم (پرویزؔ صاحب) ''جو لوگ خدا کے ضابطہ قوانین کے تحت رہیں گے اور نظام صلوٰۃ قائم کریں گے ہم ان کے اعمال کا اجر ضائع نہیں کرتے وہ اپنی زندگی اور معاشرے کو سنوارتے ہیں۔

اسی طرح سورۃ یونس کی آیات نمبر 64 میں ہے مفہوم ''ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی شادابیاں اور کامرانیاں ہیں۔ اور اگر ہم نے درج بالا اصولوں اور ضابطوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور نماز کو صرف پرستش کے معنوں میں لیتے رہے تو پھر جس طرح قرآن کریم میں سورۃ الماعون میں ہے کہ تمہاری نمازیں تمہیں تباہی اور بربادی کے جہنم میں لے جائیں گی۔

طلوع اسلام: آپ نے بالکل درست فرمایا۔ اِسی بات کو پرویز صاحب نے ایک جملہ میں یوں بیان کیا ہے کہ ''نماز الصّلوٰۃ کی سمٹی ہوئی شکل ہے۔''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے۔

☆ باغبانوں کے غیر رسمی اجتماعات ہر ماہ 15-30 تاریخ کو ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے تجربات ومشاہدات سے باغبانی کو ارتقاء کا رنگ دیتے ہیں۔

نوجوانوں کے نام

عزیز نوجوانو! میں نے ایک علم دوست جوان واجد حسین شاہ صاحب کو سیاسی اور فرقہ کی لائن سے بلند ہو کر انسانیت کی خدمت کرتے دیکھا ہے۔ آج پاکستان کو جو مشکل صورت حال درپیش ہے اس میں امن۔ ربوبیت۔ احترام۔ تعاون اور آفاقی دور اندیشی کی ضرورت ہے میں پاکستان کے نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ سیاسی اور فرقے کی لائن سے بلند ہو کر انسانیت کی خدمت میں اپنا کردار ادا کریں۔

باغبان ایسوسی ایشن آپ کو ایسا ہی پلیٹ فارم مہیا کرتی ہے۔ جہاں آپ قرآنی آفاقیت کے ساتھ ساتھ باغبانی کے تجربات بھی کر سکیں گے۔ باغبانی جہاں ماحولیات کے لئے اہم ہے وہاں ذرائع روزگار بھی مہیا کرتی ہے۔ پھلوں کی کثرت غذائیت کا شہکار بن جاتی ہے۔ سبز انقلاب کی تکمیل سے ہم بہت سے مسائل حل کرنے کے قابل ہو جائیں گے بنجر پاکستان آباد ہوگا۔

پتہ رابطہ: ملک حنیف وجدانی صدر باغبان ایسوسی ایشن سنبل سیّداں نیومری۔ پاکستان
موبائل نمبر: 0310-1547355

Surah *Al-Naziat* (النّٰزِعٰتِ) – Durus-al-Qur'an Parah 30: Chapter 5

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is June 15, 1984 and today's lecture starts with verse 6 of Surah *Al-Naziat* (النّٰزِعٰتِ).As we discussed in the previous lecture the humanistic goal of the Quranic nation is not just to gain freedom and to seek comfortable life for itself but its duty is also to free oppressed and subjugated people anywhere from their shackles of bondage and oppression. As if this was not enough, this nation further must help these people to actualize their latent potentials and invigorate them enough that they are able, on their own, to swim on the rocky waves of life's ocean. And not just catch up with other nations but surpass them and become able to solve their problems by their own thoughts, by their own intellect. This was the essential duty of that nation about which the Quran says: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) YOU ARE indeed the best community that has ever been brought forth for (the good of) mankind [Asad]. That a new nation has been raised whose life's mission is to work f or the benefit of humanity. This nation was to free other nations under bondage. This is not something that is easy that this Quranic nation sends an order to those rulers and then they allow their people to become free? I had also mentioned this in the last lecture that slave people become so accustomed to slavery that they start liking it so much that they do not want to change.

Rulers cannot exist without a people to rule

The real obstacle in the path of freedom is the force of evil represented by tyrant rulers who enslave people. On the surface it looks as if there is no harm to ask tyrants to let go of their enslaved people, as Prophet Musa (PBUH) did to Pharaoh to free the children of Israel. But Pharaoh's enrage at this demand proves the nature of all tyrants that without people how can the rulers rule? No matter how powerful a ruler may be his authority may be over mountains and oceans; he may own rivers and forests and their resources; he may own mines of precious metals and treasures of gold and silver and diamonds all these he may possess but if there are no human beings to rule over then how can he be a

ruler? To be a ruler he needs human subjects. If one wants to free his subjects then how is he going to remain a ruler? That is the reason rulers do not allow their subjects to go free.

It is said that once a lion tastes human blood it doesn t like the taste of its any other prey. Well, I don't know about lions but I have seen humans acting, not like lions, but like wolves. They don't let go of their human preys easily. Iqbal (1877-1938) has explained this in a very nice way. During the British times people were struggling for freedom. Their initial method was to pass resolutions; make requests; and send their representatives to argue the case for freedom. Iqbal said: O ignorant! Why do you have any hopes from the British? You think he will help you; that he will be sympathetic to you; that he will feel your pain; that he will pay any attention to your requests and he will grant freedom to you? Have you not noticed that if a bird gets into the claws of a hawk then no matter how much the bird cries the hawk's heart does not melt and remains impervious to her cries?

Oh ignorant one! To expect any sympathy is useless, from the West;

The heart of a hawk, no matter how much its prey cries, never melts!

How wishful is your thinking? How complacent you are? Freedom is never gained by this way. A hawk never lets its prey go free no matter how much it cries. This is how tyrant rulers behave. This is how powerful nations work. They never let enslaved nations go free easily. Thus, according to normal practice, after gaining their freedom from the tyrants of Mecca, there was no need for this newly created nation of the Prophet (PBUH) and his companions to worry about other enslaved people. They were free to decide their own matters. This is the goal of all free nations. But, here, with the new Islamic state the matter was quite different.

The duty to free other nations

My dear friends! This new nation's duty was unique among the nations of the world to free other nations. All the clashes that occurred then were, in fact, about this process of freeing other nations from the clutches of slavery. Do you see what Islam is, my friends!? And what are its obligations? Islam is not about

only prayer and fasting. This is about the clash of truth and falsehood; this is about the confrontation with tyrants that took place at the time of the Prophet (PBUH) and his companions. Was this clash to gain territory; was it to acquire empires; was it to control other nations and their resources? Well, these are the goals powerful nations have always been after throughout history. But these are not the goals of a nation established in the name of Islam, in the name of the Quran, in the name of Allah. In fact, a nation established in the name of Islam is supposed to do the opposite to free people from oppressors by directly confronting them, and if need be going to battlefield and sacrificing their own lives to free other peoples. Allahu Akbar! This is the thing I keep saying why the Quran is unparalleled not just in its words but that a nation raised in its name is also without parallel in history: a nation which is free; a nation which has everything; a nation which has no problems but such a nation readily confronts big powers to free people from their clutches even though that entails going to battlefield and sacrificing lives. This was the duty of a nation raised for the benefit of humankind. And history proves that that nation did free oppressed and enslaved people from the clutches of the superpowers of those days. They not only freed them and pulled them to the level of other nations but catapulted them into surpassing all the developed nations of the time by channeling their energies to higher and higher levels and making them masters of their own destiny.

Blueprint of the battle between truth and falsehood

My dear friends! We have now come to the starting verse of today's lecture: تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ○يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ(79:6-7) - (HENCE, think of) the Day when a violent convulsion will convulse (the world), to be followed by further (convulsions)![Asad]. A time will come when you will have to go to battlefield to confront the forces of falsehood. But this will be unlike any other clash. This will be a ground shattering clash that will shake the very foundation of oppression.

My dear friends! Now the Quran is talking about tyrants and oppressors. What will be behind them? The word the Quran uses for this is - الرَّادِفَةُ(*Al-Raadifah*)? The word ردیف "*Radeef*" meaning rhyme is from the same root. The second line of a couplet is called ردیف "*Radeef*" that rhymes with the first line. Or, among the two passengers sitting on the back of a horse or a camel, the one sitting

behind is called ردیف "*Radeef*." The Quran uses this word to show that the result of oppressing a people attaches itself to the back of the oppressors and follows them wherever they go. What a beautiful metaphor the Quran uses to depict this scenario! The clash and the confrontation that occur between liberating forces of truth and the oppressive forces of falsehood; and the consequent suffering that follows the oppressive forces is not that Allah is punishing them but that it is only the result of their own wrong actions that follows them behind and never leaves them. This is الرَّادِفَةُ (*Al-Raadifah*). Then the Quran says: قُلُوبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (79:8-9)-On that Day will (men's) hearts be throbbing, (and) their eyes downcast[Asad]. This will be the time oftheir anxiety and distress; and they will be depressed with a feeling of shame and defeat. In just two words what a scene the Quran has sketched of their state; what a scene it draws of their condition; what a picture it paints of their loss and distress! Today they have everything power, authority, dignity, and wealth. They are riding very high! But: يَقُولُونَ أَئِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ (79:10) - They say (now): "What! Shall we indeed be returned to (our) former state? [Y. Ali]. What a pithy way the Quran explains things!

An awful scene of suffering and destruction

My dear friends! You can understand the meaning of this verse in easy to understand everyday language. These powerful tyrants mocked at those confronting them by saying to each other: Look at them? They are telling us that whatever we have will be gone; that everything will be snatched away from us; and that we will return to our former pitiable state? And then, on top of that, they have guts to say: أَئِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (79:11) - "What! when we shall have become rotten bones? They pondered: Do you see what they are claiming? How lost they could be to say this utterly foolish thing about us that we will become rotten bones?" What a beautiful metaphor the Quran uses to describe what was coming to them?!

My dear friends! There are hundreds and even thousands of synonyms of certain Arabic words. One needs to pick one suitable word to describe a particular situation precisely from among those thousands of words. Archeology is the

study of past civilizations from their ruins that remain buried underground for thousands of years. Archeologists dig these sites and often times they discover remnants of whole cities revealing their one time grandeur and their artifacts. The Quran is saying here in verse (79:11) that these oppressors who seem too invincible now but all their grandeur and wealth and power will end and it will become archeological sites for future generations. What beautiful metaphors the Quran uses for nation's fall and destruction?! - أَئِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (79:11) - they will become just hollow structure of bones. But here they are saying sarcastically to each other: Look! They are warning us that: قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (79:12) - It would, in that case, be a return with loss! - That we will be destroyed? The Quran affirms that certainly this will happen; that you are as ready as a ripe fruit ready to drop to the ground: فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ (79:13) - But, then, that (Last Hour) will be (upon them of a sudden, as if it were) but a single accusing cry. And then they will face the truth: فَإِذَا هُم بِالسَّاهِرَةِ (79:14) - and then, lo, they will be fully awakened (to the truth)! They will face the truth on battlefield where all these will happen.

My dear friends! This was the initial outline for the Ummah for going out to battlefield to free oppressed human beings from the clutches of tyrants and oppressors. It was not that they were trying to free their own people enslaved by others. No, they were trying to free other people who were oppressed by their own ones. These oppressed people had no political or social relationship to the Ummah which was trying to free them by breaking the chains of their bondage simply because of relationship to common humanity. These selfless and brave souls fighting in the cause justice were obligated to protect even others' religious places of worship. The Quran says that if Allah did not make this arrangement then no place of worship would have remained protected. These are the people whose religions the Quran says are based on falsehood; it tells that their worship is شرک (shirk); it tells that their deities are false; and it strongly opposes their religions - but still it tells its followers that it is their to nations and their fate it presents its proof from history of the rise and fall of past nations. It provides witness from the pages of history of those nations.

obligation to protect their places of worship if attacked, and if need be give their lives in this cause. *Allahu Akbar!*

Maududis pronouncement - Islam spread by the power of the sword

My dear friends! Maulana Muadudi says that Islam spread by sword. The enemies of Islam had to say this anyway. But it is strange that our own people say this - May Allah protect us! Maulana Maududi was in the forefront of this crusade. His very first book is "Al -ihad fil Islam" in which he proudly peddles this myth. He goes so far in this book as to say that the Prophet (PBUH) was giving sermons and inviting people to Islam all his life but very few people accepted Islam; but the moment he picked the sword he conquered nations after nations. Then Maududi proclaims: Tell me then whether Islam spread via sermon or by sword? Well, when our own "scholars" say this which is completely contrary to the Quran, then who can blame its enemies?

My dear friends! We have come to verse 14 now. The first five verses of the Quran inculcated in its believers the conviction to first fight for their own freedom and then to fight for others' freedom wherever they may in the world. Then it further told them to help these newly liberated actualize their internal potential; help them to become strong and be able to make their own decisions; and be able to solve their problems without the help of any other nation. However, this goal invites the wrath of status quo resulting in extraordinary confrontation and fights. You know the style of the Quran that whenever it makes a claim it provides reasoning and proof for it. One way to provide proof is through scientific means of producing results through the laws of nature. Laws of nature apply equally to everything in the universe without any exception. The Quran says that just as its laws are working and producing irrefutable results in the external universe the same way its laws work and produce their results in the human universe as well. But when the Quran comes to nations and their fate it presents its proof from history of the rise and fall of past nations. It provides witness from the pages of history of those nations.

The history of the children of Israel as a witness

And now the Quran provides witness for its claim from history of a people who were the most subjugated and enslaved ones under a tyrant who was the most

ruthless in history. And these people had to be liberated from his clutches. Many examples of liberation struggles could have been given from history, but a highly illustrative example of this is the classic confrontation between Pharaoh and Musa (PBUH). The story of the children of Israel is a classical one which the Quran often repeats as an illustrative example to provide witness and proof for many of its claims. The entire population of Israelites was subject to extreme form of slavery by Pharaoh, and Musa (PBUH) was sent to free them from his clutches - who has become the standard bearer of tyranny and oppression in the history humankind. This was the confrontation that was to take place to free an entire population.

The Quran up until now offers its followers: the sound of bugle; the scene of battlefield; clash and confrontation; creating revolution. It says that this revolution is not any new revolution. This has been continuing from beginning of history - powerful nations have always been oppressing weaker nations throughout human history: That divine messengers and their followers have been uplifting weaker nations by freeing and rejuvenating them with fresh new energy. For example: هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى (79:15) - Has the story of Moses reached thee?[Asad].What a beautiful style this is of the Quran? I don't know if life will permit another chance to repeat and appreciate these things. The Quran is not a difficult Arabic book my friends. In fact, it is very easy to understand and its literary style is so beautiful and attractive, notwithstanding it deep realities. By saying: - هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى (79:15) - Has the story of Moses reached thee?- Look at the point in time from where the Quran started this? The early life of Musa (PBUH) was spent in Pharaoh's palace. But the Quran starts the discussion from the time when Musa (PBUH) received the revelation from Allah on Mount Sinai, and he was charged with the duty to liberate Israelites from the clutches of Pharaoh. The Quran starts with: اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (79:16) - The traditional translation of this is: Behold, thy Lord did call to him in the sacred valley of طُوًى (Tuwa) [Y. Ali]. But as I have often said certain key words that Quran uses to describe special situations have extremely deep and broad meaning, e.g., the words describing the high place a messenger occupies and the divine revelation he receives. The one who is going to receive revelation

does not have any clue of it even a day before of being selected for this high honor. But such a person - born and raised in the same way of life and customs and rituals as every one else in the society - stands completely unhappy with the status quo; his heart very much restive and wounded with what goes on around him as he remains extremely driven and restless in search for truth since the knowledge of reality eludes him. This is his state before receiving the revelation. It is mentioned about the Prophet (PBUH): وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدَى (93:7). The traditional translation of this verse is: And found thee lost on thy way, and guided thee?[Asad].But ضَآلًّا (*Daallan*) does not really mean "lost." A prophet even before receiving the revelation is never lost but extremely unhappy with the status quo and intensely driven in search of truth.

My dear friends! The meaning of ضَآلًّا (*Dallan*) is: one who, in search of truth, is in a state of discovery; he remains passionately driven to explore around to find the truth about life. The Quran mentions this about our Prophet (PBUH); and it has especially stated about Musa (PBUH) that he was very curious to find out about reality of things from any wise person he could find. Before he became a prophet, Musa (PBUH) met a wise man popularly known as Khidr (خضر) - although his name did not appear in the Quran - and all this was part of his long journey of discovery. But this search process ended after being selected to receive revelation and then others came to them in need of truth and guidance. What does the guidance of revelation do? - It wraps that very long journey of discovery of truth and search for reality. The meaning of the word مُقَدَّس (*Muqaddas*) is: one who journeys very far ; and the meaning of طُوًى (Tuwa) is: to wrap up. So, the meaning of the verse (79:16) is: Musa (PBUH) - your long journey in search of truth ends and it is being wrapped up now.

Difference between revelation and intellect

Searching for truth using one's own mind is a long hard journey. evelation, on the other hand, folds this long road into a short process. This is the difference between the two sources of knowledge: one subjective and the other objective. Iqbal (1877-1938) has explained this difference at many places. He says:

Though intellect and revelation both guide and travel towards destination;

However, intellect travels by trial and error; and by giant strides revelation!

Intellect works towards reality by trial and error. But revelation brings the reality directly in front of intellect. There is no long journey involved with revelation as it is the case with intellect that tries to reach reality by trial and error. My dear friends! The nation that inherits the Quran is in an advantageous position compared to other nations. Where as ot her nations remain nowhere near reality even after centuries of failed experimentsincluding long wars and huge bloodsheds, just one verse of the revelation guides its nation directly to the reality. This is the difference between the two. This is بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (79:16): Those were the long hard journeys that were wrapped up إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ - when his Nurturer called him: O Musa! Your long winding journey in search of truth has been wrapped up, it has finally ended. And listen to what I have to say carefully: a huge responsibility is being placed on your shoulders. Well, those who are very special to Allah carry a special burden entrusted to them by Him. Being selected to receive Allahs revelation is no small blessing.Listen Musa: اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (79:17) - "Go unto Pharaoh - for, verily, he has transgressed all bounds of what is right [Asad]. It says it all - just in one word طَغَىٰ (*Taghaa*).

Musa (PBUH) and Pharaoh

Pharaoh had crossed all lines in his transgression and aggression. So, Musa (PBUH) was ordered to go Pharaoh. This divine duty was entrusted to Musa (PBUH). In the next verse there is a point that I don't know how to explain. It requires highly focused thinking. As we have seen it is the divine duty of this Ummah to free subjugated and oppressed people from slavery and subjugation. Musa (PBUH) was sent to confront Pharaoh as he had transgressed all humane boundaries. Normally whenever there is confrontation and war it is all about authority, control, and empire building. And don't ask what happens to the defeated nations - disgrace, humiliation, subjugation, imprisonment, torture, and death awaits them. This happens all because of greed and vengeance. But a nation that has been created in the name of Allah, His prophets and messengers

are different. Please listen carefully what the Quran says when the very first revelation that is given to Musa (PBUH) when is ordered to go to Pharaoh:

فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ (79:18) - and the (traditional) translation is: and say (unto him), Art thou desirous of attaining to purity? [Asad].

But my dear friends, the single word "تَزَكّٰی" of the Quran in this verse changed the world of politics. Allah orders Musa to go to Pharaoh and tell him: You have authority; you have your empire; you have all the wealth. You have all these things but your human potential has remained undeveloped; that you have not reached the human level. This is the reason that after having all these things although you have become a ferocious and tyrant animal but you could not become human; that I have come to develop your human potential and raise you to the level of a human being. Allahu Akbar! What is the goal that is being mentioned here for confronting this legendary tyrant? Yes, everything is yours but you could not become human. How to make him human? By using the hammer? By "خَلْدَةً" flogging? No. By "تَزَكّٰی" - developing and nourishing his human potential. This is the Quran my friends! You wont find this teaching anywhere else.

Political system of the Quran

My dear friends, with the Grace of Allah people in my audience are thinkers. So, please listen carefully to this point on which a political structure can be erected! This nation when it confronts another nation which on surface can be called war but what is its goal? The Quran says that its followers confront a nation only because that nation is not at the level of humanity. Otherwise, the Quran tells it followers to join hands with those who potentials have been developed and cooperate with them to uplift humanity. This is the political system of the Quran my friends! Raise the humanity of its own people by human development and nourishment and help other nations in this process. It is absolutely and totally against using authority and power to crush people as Pharaoh did, and what the latter-day Pharaohs do in the name of politics: يُذَبِّحُ أَبْنَآءَهُمْ (28:4) - Those who show signs of true and selfless leadership of their

people these Pharaohs clip their wings, nip them in their buds just as a gardener with a scissor clips the branches that grow taller in order to create conformity. The governments of the world run on the authority of such a scissor and clip the wings of any one who shows human potential for growth and leadership.

The bottom line of Quranic politics is this: Nourish and develop the potential of the downtrodden and suppressed people so that they can grow and rise. And the political system of the Quran confronts those who hold power and authority and brings them to the level of humanity by saying to them: فَقُلْ هَلْ لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ (79:18) - Wont you wish to be nourished and purified and to develop your potential so that you could renounce your animal instincts and join the ranks of humanity? How to make that happen? What will be the process of this transformation? Musa (PBUH) said to Pharaoh: I will tell you this process and I will guide you to the way which if you follow then Allah, the Sustainer, will provide the necessary nourishment that will transform you. For this, there is no need to be fearful of anyone except the law of requital of your Sustainer: وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ (79:19) - (If so,) then I shall guide thee towards (a cognition of) thy Sustainer, so that (henceforth) thou wilt stand in awe (of Him). [Asad]. There are many other beautiful names of Allah. But why did the Quran say here "إِلَىٰ رَبِّكَ"? We will soon find out. The Quran says: فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ (79:20) - And thereupon he (went to Pharaoh and) made him aware of the great wonder (of God's grace). [Asad]. Musa presented to Pharaoh the magnificent order of the divine system. He made him aware: that this is the system which guarantees freedom to all of humanity; that no human being remains subjugated to no other human being in this system; that this system brings violent and aggressive wolves like you to the level of humanity; that you have too much energy that is being spent on wrong paths that needs to be redirected into right channels. But the traditional interpreters say that the "الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ" was the staff which turned into snake; and Musas hand turned white. We have covered these before and we will explain their meanings as needed in future. But what the Quran is talking about here is to transform Pharaoh and to get him to the ranks of humanity; to warn him of the

consequences of his wrong path; and to direct his energies into the right channels. But he was drunk with power of authority: فَكَذَّبَ وَعَصٰى (79:21) - But (Pharaoh) gave him the lie and rebelliously rejected (all guidance) [Asad]. He told Musa that what you are telling that the result of my system is destruction and death is all wrong. He, instead of accepting divine guidance, became even more rebellious: ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى (79:22) - and brusquely turned his back (on Moses). The story of confrontation of Musa (PBUH) with Pharaoh has been described at many places in the Quran in great detail.

But the Quran in its last part does not repeat the details of those stories. It points to them briefly and moves on. The Quran has itself given the method for its understanding that is, using concordance and cross referencing. This way we can understand fully any topic in the Quran even when in some verses the topic is briefly sketched. Since the story of the confrontation of Musa (PBUH) and Pharaoh are described in detail elsewhere in the Quran, here, in this verse under discussion (79:22) it simply tells: ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى . What to say of the Quran my friends! These are just two words: means that he turned his back on Musa this is a negative aspect of his reaction. But Pharaoh just didnt stop at that.But he started planning against Musa (PBUH): means that he started working on a plan to succeed. He started plotting and scheming: فَحَشَرَ فَنَادٰى (79:23) - and then he gathered (his great ones), and called (unto his people). Pharaoh had realized that he cannot defeat Musa (PBUH) in game of politics. He also knew that Musa was among the powerful people in his nation being raised in his own palace so he could not physically harm due to fear of mass scale rebellion. Pharaoh was very clever strategist with deep knowledge of politics.

Weapon of religious priesthood

My dear friends! The Quran gives more details about how Pharaohs advisers were getting impatient with these two brothers Musa and Haroon. They told Pharaoh to be tough with them; otherwise these two brothers will dethrone him. They advised Pharaoh not to wait any further. But Pharaoh told them: I knew better how to deal with them but not the way you want. What to do? - Well, lob the ball of religious priesthood against them. What cannot be achieved with

power can be achieved by religious priesthood. How far-sighted was Pharaoh! He thought history will repeat itself: that what a dictator with all his power and authority could not do, just one religious fatwa could do it. The demise of Abbasids empire didnt happen for lack of power and authority. nce the debates about religious issues took the front stage, bloodshed and decline followed. What were the great debates they were engaged in that led to the blood flowing in the streets of Baghdad? - Fatwas about declaring one unbeliever; problems of whether or not the Quran is created; issues about predestination and fate and consequent sectarian fights of Asharites and Mutailites etc. What are called problems of "*Ilm-ul-Kalam*"or metaphysics were hotly debated and contested which had nothing to do with problems of life. These were issues that led to bloodshed and demise of the Abbasid dynastic empire. ings didnt do this. This was done by religious priesthood. Pharaoh had thought about this plan. He gathered all his people and what is the first thing he tells them to keep in mind? He tells them to remember: Who I am and how you are my slaves and obedient servants; and how I control everything? Now, just a few minutes ago I mentioned why it was said here إِلَىٰ رَبِّكَ ? Well, Pharaoh gathered his people: فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (79:24) - and said, I am your Lord All - Highest![Asad]. He asks them: Tell me who is your sustainer and provider? Who controls all the sources of sustenance? The biggest weakness of human being is hunger and bread. When Pharaoh calls himself here - أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ - then it does not mean that he is asking his people to worship him. The people were not worshipping him. And Pharaoh himself was worshipping the Sun-god. Here رَبُّكُمْ(*Rabbukum*) means he is claiming to be their provider and sustainer. This meaning becomes very clear if we look at another reference: وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي (43:51) - And Pharaoh issued a call to his people, saying: my people! Does not the dominion over gypt belong to me, since all these running waters flow at my feet? Here, he is directly asking his people: Tell me who is owner of all the lands and all the waters for irrigation, the rivers and canals? Tell me! Are all these not mine? I am the sole owner. If I stop this sustenance from you even for a day, then you will know what I mean? Now tell me is this not true?

Being deprived of bread

Did you see? This is the real deal my dear friends! This is how humans are controlled directly or indirectly. Control the sources of sustenance and you can control human beings. This is exactly like the ringmaster in a circus who is able to control even the king of animals, the ferocious lion. Why does the lion do whatever the ringmaster wants him to do? - Because it gets food only after it has performed its routine in the circus. It does not get anything before that. The lion gets into this routine and forgets its own nature. Now look at Pharaoh? He says: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى - on a smaller scale one can be given some bread some of the times, but, when one claims the highest level (الْاَعْلٰى) of authority it is altogether a different matter. Am I not the highest of all sustainers, Pharaoh thunders? And then his big ego is reflected by the plural pronoun We or " اَنَا ". This is the style of the Quran where We is used instead of I to represent power and authority. Then the Quran says: فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (79:25) And thereupon God took him to task, (and made him) a warning example in the life to come as well as in this world.[Asad]. So, the Quran is telling here: Look at what happened even to that greatest of tyrants, Pharaoh, who had full control over the sources of sustenance? The chains that he had placed on his people were flipped on to him for the crimes he had committed before and the crimes he was to commit later.This happened according to the divine system of the law of requital. This is the meaning of "نَكَالَ" (*Nakaal*) – to constrain someone and stop his movement. This needs further explaination.

Another name of wrong action is punishment

My dear friends! Here in (79:25) it is said that it is not that Pharaohs authority was snatched; that he was defeated and made a prisoner; that he was punished and tortured. This was not the case and neither the goal. He had transgressed all limits and had committed crime against humanity. The Quran has used the word "نَكَالَ" (*Nakaal*) here which means Pharaoh was restrained; that limits were put on him. Whatever his crimes; whatever his wrongs actions; and whatever wrong system he had implemented and put in place; and whatever wrong he was doing

further the results of all these wrongs got attached to his back like *Radeef*; it was as if these results got stuck to Pharaohs back and sat behind him on the camel of his tyranny that he was riding and went wherever he went, and these became the fetters and chains for Pharaoh in the end. This is called "نَكَالَ" (*Nakaal*) my friends! This is the same thing the Quran has said as punishment to cut the hands of a thief (5:38), metaphorically speaking.This is to make such a restriction or "نَكَالَ"(*Nakaal*) that one cannot do such things. Now the Quran says: إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ (79:26) - In this, behold, there is a lesson indeed for all who stand in awe (of God).[Asad]. That is, the story of the confrontation of Pharaoh and Musa (PBUH) that We have repeated here and the consequent liberation of Israelites that We have mentioned this is not just for the sake of history but for "عِبْرَة" or learning lesson. The meaning of "عِبْرَة" is very remarkable. Its root meaning is bridge. The bridge is a means by which one standing on one side of it and whose destination is a road on the other side, is able to get to his destination. The story is only a metaphor; it is a simile; it is a symbol - i.e., it is a bridge by which one can reach the reality. Please do not simply read the words of the Quran as beautiful stories and feel happy about it. This is not the aim of the stories described in the Quran. These stories are, in fact, bridges by which one has to reach the deeper realities of life for which the Quran says: لِّمَن يَخْشَىٰ - one must be fearful of the wrong consequences of violating the divine laws. So, one must submit to these laws wholeheartedly. This is the meaning of يَخْشَىٰ - that is, one should submit to these because transgressing them will bring the same result as happened to Pharaoh.

My dear friends! We have covered until verse 26 of Surah *Al-Naziat* (النَّازِعَاتِ) This topic concludes here. Next is a different topic of how the external universe provides witness for Quranic realities. This we will discuss in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL® AND QUAID-E-AZAM®

CPL NO. 28
VOL.68
ISSUE
4

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com